بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

تحریک ادب
شمارہ جنوری-2025 جلد نمبر 18
Tahreek-e-adab vol-18, issue-85 January 2025

Editor مدیر
Jawed Anwar (Dr.Jawed Ahmad) (ڈاکٹر جاوید احمد) **جاوید انور**
cell-0091-9935957330

مجلس ادارت
Editorial board and Peer Review committee
پروفیسر صغیر افراہیم، سابق صدر شعبہء اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
Prof. Sagheer Afrahim Ex.Chairman Dept.of Urdu A.M.U.
پروفیسر شہاب عنایت ملک، سابق صدر شعبہء اردو، جموں یونیورسٹی
Prof.Shohab Inayat Malik HOD Urdu,Jammu University
ڈاکٹر شمس کمال انجم، صدر شعبہء عربی، بابا غلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی
Dr. Shams Kamal Anjum, H.O.D. Arabic, Baba Ghulam Shah Badshah University,Rajouri (J&K)
پروفیسر محفوظہ جان، صدر، شعبہء کشمیری، کشمیر یونیورسٹی
Prof. Mahfooza Jaan(H.O.D.Kashmiri,Kashmir University)
پروفیسر شاہینہ رضوی (سابق صدر، شعبہء اردو، مہاتما گاندھی کاشی ودیاپیٹھ یونیورسٹی، وارانسی)
Prof.Shahina Rizvi(Ex.HOD,Urdu,MKVP University,VNS.)
ڈاکٹر دبیر احمد، صدر شعبہء اردو، مولانا آزاد پی۔جی۔کالج، کولکاتا
Dr. Dabeer Ahmad,H.O.D.Urdu, Maulana Azad P.G. College,Kolkata
ڈاکٹر احسان حسن، شعبہء اردو، بنارس ہندو یونیورسٹی
Dr.Ehasan Hasan,Dept of Urdu BHU Varanasi

مجلس مشاورت

Advisery Board and Peer Review committee

نجمہ عثمان،،اشتیاق احمد،عرفان عارف،ڈاکٹر چمن لال

Najma Usman (Surrey, United Kingdom)

Ishtiyaq Ahmad (General Secretary, Sir syed society Varanasi)

Irfan Arif (H.O.D.Dept. of Urdu,GDC Reasi University of Jammu,

Dr.Chaman Lal Bhagat (Asst. Prof.Dept. of Urdu,Jammu University,Jammu)

Name Tahreek-e-Adab(Urdu Monthly)

ISSN 2322-0341

سال اشاعت: Year of Publication 2025 (جلد نمبر18)Vol-18

شمارہ نمبر شمارہ 85 ۔جنوری،2025 Issue January

سرنامہ خطاط:انور جمال Title name Artist : Anwar Jamal, Varanasi

سرورق : عظمیٰ اسکرین Title cover Uzma Screen, Varanasi

فی شمارہ : دوسو روپئے 200/-Two Hundred rs. per copy

زرسالانہ : دوہزار روپئے (رسالہ صرف رجسٹرڈ ڈاک سے ہی بھیجا جائے گا)

Annual Membership 2000/- rs. two Thousand Rupees

تاعمر خریداری (ہند): بیس ہزار روپئے

Life Time: 20000/- Twenty Thousand rs.(only india)

چیک یا ڈرافٹ اور انٹرنیٹ بینکنگ کے ذریعے زر رفاقت یہاں ارسال کریں۔

Please send your subscription amount or donation through cheque,draft or internet banking on the following:

Jawed Ahmad IFSC SBIN0005382 A/C no. 33803738087
State Bank Of India,Branch-Shopping
centre(B.H.U.Campus.B.H.U.Varanasi-221005(U.P) India

اس شمارہ کی مشمولات میں اظہار کیے گئے خیالات ونظریات سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں۔
The content/idea expressed in any article of this journal is the sole responsibility of the concerned writer and this institution has nothing to do with it.

متنازعہ تحریر کے لیے صاحب قلم خود ذمہ دار ہے۔تحریک ادب سے متعلق کوئی بھی قانون چارہ جوئی صرف وارنسی کی عدالت میں ممکن ہوگی۔
Any legal matter pertaining to tahreek-e-adab will be possible only in the jurisdiction of Varanasi court.

جاوید انور مدیر تحریک ادب نے نیہا پرنٹنگ پریس، وارانسی سے شائع کرار دو آشیانہ ۱۶۷، آفاق خان کا احاطہ، منڈواڈیہہ بازار، وارانسی سے تقسیم کیا۔
Jawed Anwar Editor Tahreek-e-Adab has got this journal published from Neha Printing Press, Varanasi and distribute it from Urdu Ashiana,167 Afaq Khan Ka Ahata,Manduadeeh Bazar,Varanasi-221103

فہرست

1۔مومن کافر میں کیا جانوں، خود فریبی سی خود فریبی ہے صدق، صبوری، کلمۂ حق (میں زندہ آدمی ہوں)	خالد حسین	5
2۔ڈیجیٹل کلاس رومز میں سماجی جذباتی اکتساب	پروفیسر نوشاد حسین	30
3۔جموں وکشمیر میں اسکول کی تعلیم پر کووڈ۔19 کا اثر اور حکومت کے اقدامات	ڈاکٹر سبرینہ جاوید	41
4۔اختر الایمان کی نظموں کے امتیازی پہلو	ڈاکٹر سبرینہ جاوید	51
5۔شوکت حیات کی افسانہ نگاری	مبینہ بی	59
6۔نگار شات اختر کا اسلوبیاتی مطالعہ	ڈاکٹر محمد نعیم رضا	70
7۔اختر اورینوی: ارباب علم وادب کی نظر میں	ڈاکٹر محمد نعیم رضا	79
8۔ترویج وتشویق تاریخ نگاری در عہد اکبری	محمد محفوظ عالم	88
9۔ڈاکٹر محمد مستمر کا ادبی سفر: تنقید سے فکشن تک	ڈاکٹر رفیق احمد	97
افسانہ		
1۔لکیریں	پروفیسر شاہینہ رضوی	105

Momin Kafir main kya jaanu,dil dariya bahta jaye,be libaas aayine

(Main Zinda Aadmi hoon) by Khalid Hussain (RTD. D.C) Jammu

خالد حسین (جموں) cell-7006898585, 9419183485

مومن کافر میں کیا جانوں

اردو کا شعر ہے:

زاہد تنگ نظر نے مجھے کافر جانا
اور کافر یہ سمجھتا ہے کہ مسلمان ہوں میں (اقبالؔ)

خالد حسین اپنی آزاد خیالی اور مذہبی ٹھیکیداروں بارے منفی سوچ کی وجہ سے مذہب کی غلط تشریح کرنے والے نام نہاد مولوی صاحبان اور کٹّر پنتھی دھرم گورو اور سوامی جن اُن سے دُکھی رہتے تھے۔ اُن کا یہی نظریہ دیگر مذاہب کے شدّت پسند لیڈروں کے بارے میں بھی تھا۔ اسی لئے خالد حسین کو پنڈت پُجاری اور 'ملا' بخاری، کانٹوں کی طرح چُبھتے تھے کیونکہ وہ اندھ وشواسی پر یقین نہیں رکھتے تھے اور چاہتے تھے کہ دلیل کے ساتھ آدمی اپنی بات منوائے۔ جبھی تو اُن کے دوست احباب اور عزیز واقارب اُنھیں باغی سِر پھرا پاگل اور مرتد کہتے تھے۔ وہ اپنی بات کھُل کر اور صاف لفظوں میں کرنے کے عادی تھے۔ چھل فریب اور لحاظ داری اُن کی خصلت نہیں تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اکثر الزامات کے بھنور میں پھنسے رہتے۔ اوپر سے سونے پر سہاگہ یہ ہوا کہ اُن کا بیٹا شدّت پسندوں کے ہاتھوں کا کھلونا بن گیا اور بالآخر جیل کی کال کوٹھری میں ٹوٹ گیا۔ کئی سالوں تک وہ بیٹا اُن کی ہتھیلی کا چھالا بنا رہا کیونکہ اُس نے خالد حسین کی سوچ پر ڈاکہ ڈالا تھا۔ جس کی وجہ سے اُن کے دل ودماغ پر کئی خراشیں لگی تھیں۔ دھرم اور سیاست کے نام پر اپنی لیڈری چمکانے والے انھیں بدنام کرتے رہتے اور خفیہ ایجنسیوں سے اُس کی شکایتیں کرتے رہتے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ جہاں جہاں بھی خالد حسین کی پوسٹنگ ہوئی۔ خفیہ اداروں کے کارندے اُن کا پیچھا کرتے رہتے اور اُن کی پوری خبر رکھتے۔ ان باتوں کا میں چشم دید گواہ ہوں کیونکہ میں نے اُن کے ماتحت کام کیا ہے اور اُن کی صاف گوئی کا ہمیشہ سے شیدائی رہا ہوں۔ میرا نام بھولا ناتھ ہے۔ یہ جنوری 1993ء کی بات ہے جب خالد حسین راجوری ضلع کے اسسٹنٹ کمشنر ڈیولپمنٹ تعینات تھے۔ ایک دِن ''آئی، بی'' کے دو افسر دفتر آئے اور

ہندو ملازموں سے پوچھنے لگے کہ اُن کا افسر خالد حسین کیسا آدمی ہے؟ یہ جانتے ہوئے کہ خالد حسین علاقے کے دورے پر گئے ہیں، وہ دفتر میں آئے تھے۔ اُنہوں نے پوچھا کہ غیر مسلم ملازموں کے ساتھ اُن کا سلوک کیسا ہے؟ وہ اُنھیں تنگ تو نہیں کرتے؟ کیا وہ بھارت مخالف باتیں کرتے ہیں۔ پاکستان اور کشمیر مسئلے کے بارے میں اُن کا نظریہ کیا ہے؟ کیا وہ اُگر وادیوں کے ہمدرد ہیں؟ جب ہم نے کہا کہ سبھی ملازموں کے ساتھ اُن کا رویہ غیر جانبدارانہ ہے اور وہ ہندو اور مسلمان میں کوئی فرق نہیں کرتے اور ہم نے اُن کے مُنھ سے کبھی ملک دشمن باتیں نہیں سُنیں، تو وہ ہمارے بیان لیکر چلے گئے۔ بالکل اسی طرح کی پوچھ گچھ ڈوڈہ اور پونچھ میں بھی کی گئی جب وہ وہاں اپنے انتظامیہ فرائض انجام دے رہ تھے۔ ہر جگہ غیر مسلم ملازموں نے خالد حسین کے بارے میں اچھے بول بولے تھے۔ ادب اور ادیبوں کے ساتھ گہرا رشتہ رکھنے کے کارن خالد حسین جہاں بھی جاتے، وہ ادبی اور ثقافتی سرگرمیاں جاری رکھتے۔ 1987ء میں جب وہ اے، سی، ڈی ڈوڈہ تھے تو اُنہوں نے وہاں ولی محمد اسیر کشتواڑی اور محمد اسحاق زرگر کے ساتھ مل کر آل انڈیا اردو مشاعرہ کروایا، جس میں ہندوستان بھر سے شعراء تشریف لائے تھے۔ تین شاعر خالد کفایت، عارف حلیم اور رمضان سعید مالیر کوٹلہ سے آئے تھے۔ خالد کفایت خالد حسین صاحب کا بہت اچھا دوست تھا اور علم عروض کا ماہر بھی۔ مشاعرے کے اختتام پر مالیر کوٹلہ سے آئے تینوں دوست خالد حسین کے پاس کچھ دنوں کے لئے رک گئے۔ دراصل ماسٹر رمضان سعید اُن دِنوں قرآنِ پاک کا پنجابی ترجمہ کر رہا تھا، جو اصل میں مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کے اُردو ترجمہ سے اخذ کیا گیا تھا۔ وہ پنجابی میں ترجمہ کئے ہوئے چند سپارے ساتھ لایا تھا تاکہ خالد حسین کو ترجمہ سنایا جائے اور زبان و بیان کے حوالے سے خامیوں کو دور کیا جا سکے۔ وہ سب اکٹھے بیٹھتے اور ایک سپارے پڑھتے جاتے۔ لیکن خالد حسین نے اُن سے کہا کہ وہ قرآن مجید کا عربی متن اور اس کا اردو ترجمہ بھی پڑھتے جائیں۔ خالد حسین پہلے عربی میں آیات پڑھتے پھر مودودی صاحب کا کیا ہوا ترجمہ پڑھتے اور آخر میں پنجابی ترجمہ پڑھتے اور ضرورت کے مطابق پنجابی کا ٹھیٹھ لفظ ڈھونڈ کر دیتے۔ ترجمے میں فارسی اور اُردو کے الفاظ کو کم سے کم کر کے اُن کے بدلے پنجابی زبان اور اُس کی ذیلی بولیوں سے الفاظ منتخب کر کے اُنھیں استعمال کرنے کیلئے کہتے۔ یوں خالد حسین کی سرپرستی میں تین سپاروں کے ترجمے کی زبان میں ضروری سُدھار کیا گیا اور خالد صاحب نے کہا کہ باقی کا ترجمہ بھی اُسی طرح کیا جائے۔ رمضان سعید کو پنجابی ترجمہ کرنے میں تقریباً دو سال لگ گئے۔ جب بھی اُسے ضرورت پڑتی تو وہ خالد حسین سے ٹیلی فون پر رابطہ قائم کر کے مشورے لیتا۔ پنجابی قرآن مجید

جماعت اسلامی ہند نے اپنے خرچے پر چھپوایا اور رسمِ اجرا کے موقع پر خالد حسین کو بھی بُلایا گیا۔ خالد حسین اُن دِنوں ضلع جموں کے ایڈیشنل ڈپٹی کمشنر تھے۔ وہ یوم آزادی کی تقریب کی تیاریوں میں مصروف تھے جب اُنھیں مالیر کوٹلہ سے خالد کفایت کا فون آیا کہ 16/ اگست 1998 کو پنجابی قرآنِ پاک کی تقریب رونمائی دِن 11 بجے اسلامیہ ہائر سیکنڈری سکول مالیر کوٹلہ میں ہوگی اور اُن کی شمولیت اس لئے بھی ضروری ہے کہ وہ اس فنکشن کے ایک مُقرر ہیں۔ 15/ اگست کی پریڈ ختم ہوتے ہی خالد حسین مالیر کوٹلہ کے لئے روانہ ہوگئے۔ تقریب رُومانی کی صدارت مرکزی وزیر زراعت سُرجیت سنگھ برنالہ کررہے تھے جبکہ مہمانِ خصوصی پنجابی یونیورسٹی پٹیالہ کے وائس چانسلر تھے۔ خالد حسین نے اپنی تقریر میں کہا کہ اپنی مادری زبان میں قرآن کو پڑھنا اور سمجھنا انتہائی اہم ہے کیونکہ ہمارے لوگ عربی زبان نہیں جانتے۔ پنجابی (گورمکھی) زبان میں یہ ترجمہ غیر مسلم بھائیوں کے لئے بھی ایک نایاب تحفہ ہے۔ کیونکہ وہ اللہ کے پیغام اور اسلام کی عظمت کے بارے میں جان سکیں گے اور مذہبی منافرت پھیلانے والی شدّت پسند قوتوں کے عزائم سے بھی عام لوگ واقف ہوسکیں گے۔ خالد حسین نے اپنی ماں کی مثال دیتے ہوئے کہا کہ اُن کی ماں پچھلے پچاس سالوں سے قرآنِ مجید کی تلاوت کررہی ہے لیکن اُسے قرآنی آیات کا مفہوم بالکل نہیں پتہ، جب ایک دفعہ اُنہوں نے ماں سے پوچھا کہ جب وہ عربی الفاظ کے معنی نہیں جانتی ہیں تو پھر کیوں پڑھتی ہیں۔ تو ماں نے جواب دیا تھا کہ اللہ کا کلام پڑھنے سے ثواب ملتا ہے۔ جبکہ قرآن میں بیان کیا گیا ہے کہ ''اسے'' پڑھو، سمجھو، غور وفکر کرو پھر عمل کرو۔ لیکن طوطے کی طرح آیات کو رٹ لینا اور مطلب نہ جاننا، کوئی ثواب نہیں بلکہ اگر غلط پڑھا جائے تو گناہ ہے۔ شاید وہاں خفیہ ایجنسیوں کے لوگ بھی رپورٹنگ کررہے ہوں گے۔ اُنہوں نے مرکزی وزارت داخلہ کو خالد حسین کے خلاف رپورٹ بھیجی اور لکھا کہ متذکرہ تقریب میں خالد حسین نے بھارت سرکار کے خلاف زہر اُگلا اور اُگروادیوں کے حق میں بولا ہے۔ مرکزی وزارتِ داخلہ کے سیکرٹری نے ایک خفیہ چٹھی جموں وکشمیر کے چیف سیکرٹری اشوک جیٹلی صاحب کو لکھی اور چٹھی کے ساتھ آئی، بی، پنجاب سے حاصل ہوئی رپورٹ کی کاپی بھی نتھی کردی۔ چیف سیکرٹری صاحب نے صوبہ جموں کے ڈویژنل کمشنر بلدیو سنگھ جسوال کو انکوائری کرنے کے لئے کہا۔ دوسری طرف ریاستی خفیہ محکمہ سی، آئی، ڈی نے بھی اپنے طور پر انکوائری کرنی شروع کردی۔ وہ خالد حسین کے سرکاری ڈرائیور پی، ایس، او، اور وائرلیس آپریٹر سے پوچھتے کہ اُن کا افسر بار بار پنجاب کیا لینے جاتا ہے؟ وہاں وہ کس کس سے ملتا ہے؟ اُس کا تعلق کس دہشت گرد تنظیم سے ہے؟ وہ سرکاری کار کی تلاشی لیتے۔

وائرلیس سیٹ کو نکال کر اُسے چیک کرتے ۔کبھی ڈِکی کھول کر دیکھتے ۔ایک دِن خالد حسین کا ڈرائیور اُنھیں کہنے لگا کہ وہ سی، آئی، ڈی کے اعلیٰ افسران سے کیوں نہیں بات کرتے پولیس کے اہلکار اُنھیں بار بار تنگ کرتے ہیں۔تو خالد صاحب کا جواب ہوتا کہ اُن سے جو پوچھا جائے ۔اُس کا وہ صحیح صحیح جواب دیں۔ سچ کہنے میں کیسا ڈر۔صرف اِس بات کا دھیان رہے کہ وہ کسی کو اس بارے کچھ نہ بتائیں ۔وہ لوگ اپنی ڈیوٹی کر رہے ہیں ۔اُنہیں کرنے دیں۔ وہ لوگ تیل دیکھیں اور تیل کی دھار دیکھیں۔کسی کو اس بات کی خبر نہ ہونے دیں۔ ورنہ ڈپٹی کمشنر کے عہدے کی بدنامی ہوگی۔خالد حسین نے کہا کہ جب وہ اُنھیں بُلائیں گے تو وہ خود اُنھیں جواب دیں گے۔ پھر ایک دِن ڈویژنل کمشنر جموں بلدیو سنگھ جسوال صاحب نے خالد حسین کو اپنے دفتر میں بُلایا اور اُن کے سامنے مرکزی وزارت داخلہ کی رپورٹ اور چیف سیکرٹری صاحب کی چٹھی رکھ دی اور پوچھا کہ یہ کیا ماجرا ہے؟ کیا اُس نے مالیر کوٹلہ میں بھارت سرکار کے خلاف کوئی تقریر کی ہے؟ جب خالد حسین نے انکار کیا اور کہا کہ یہ سب بکواس ہے تو جسوال صاحب نے ثبوت مانگا۔خالد حسین نے ڈویژنل کمشنر کے ٹیلی فون سے ہی اُس پروگرام کے منتظمین سے مالیر کوٹلہ بات کی اور ساری بات بتائی اور کہا کہ اگر پروگرام کی آڈیو یا ویڈیو ریکارڈنگ کی سی، ڈی کل صبح تک اُنھیں بھیج دی جائے تو مہربانی ہوگی۔ دوسرے دِن صبح مالیر کوٹلہ سے ویڈیو کیسٹ آ گئی جسے لے کر خالد حسین ڈویژنل کمشنر جموں کے دفتر پہنچے اور کیسٹ اُن کے حوالے کی ۔جو کیسٹ پلیئر پر چلائی گئی۔جسوال صاحب نے پوری کیسٹ دیکھی۔خالد حسین کی تقریر میں ایک بھی لفظ ایسا نہیں تھا۔ جو بھارت سرکار کے خلاف اور اُگروادیوں کے حق میں کہا گیا ہو۔جسوال صاحب بہت خوش ہوئے ۔وہ خالد حسین کے بے تکلیف دیرینہ دوست تھے۔دونوں نے مرزا محمد افضل بیگ صاحب کے ساتھ اکٹھے کام کیا تھا۔اُنھیں شک تھا کہ کہیں جذبات کی رو میں بہہ کر خالد حسین نے کچھ اُلٹا سیدھا نہ کہہ دیا ہو، جس کی وجہ سے وہ بھی فکر مند تھے۔جسوال صاحب اُسی وقت اپنی کُرسی سے اُٹھے۔کیسٹ کوٹ کی جیب میں ڈالی اور چیف سیکرٹری صاحب کے دفتر چلے گئے جہاں ڈائریکٹر جنرل پولیس ڈاکٹر گوبچن جگت بھی بیٹھے تھے۔سب نے اکٹھے بیٹھ کر وہ کیسٹ دیکھی اور خوش ہوئے۔جٹیلی صاحب نے ویڈیو کیسٹ کی کاپی اپنی چٹھی کے ساتھ مرکزی داخلہ سیکرٹری کو بھیجی اور خالد حسین کے بارے میں تعریفی کلمات بھی لکھے۔.....ایک دِن خالد حسین کو چیف سیکرٹری صاحب نے اپنے دفتر میں بُلایا اور اُن کے کام کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ وہ پونچھ جانے کے لئے تیار رہے کہ کیونکہ پونچھ ضلع میں اُنھیں اُس جیسے تجربہ کار ڈپٹی کمشنر کی ضرورت ہے۔نفرت، چغل خوری اور

ذاتی عناد کا نتیجہ یہ نکلا کہ خالد حسین ضلع پونچھ کا ڈپٹی کمشنر بن گیا۔

1990ء میں جب خالد حسین اے، سی، ڈی پونچھ تھے تو ایک سابقہ ممبر اسمبلی اور ماہر دل بدلو (نیشنل کانفرنس جمع کانگرس جمع بھارتیہ جنتا پارٹی جمع پی ڈی پی برابر ہے۔ ایم، ایل، سی اور وائس چیئر مین گوجر بکروال ترقیاتی بورڈ) اپنے کچھ حواریوں کو ساتھ لے کر خالد حسین کے دفتر میں آدھمکا اور کہنے لگا کہ میرے اِن پانچ ورکروں کو بھی پنچایت کے ترقیاتی کام دیئے جائیں جبکہ اُس کی سفارشی چٹھیوں پر اُس کے ساٹھ سے زیادہ ورکروں کو مختلف پنچایتوں میں ترقیاتی کام دیئے جا چکے تھے ۔خالد حسین نے اُس کے مزید ورکروں کو کام دینے سے صاف انکار کر دیا اور بدتمیزی کرنے پر اُنھیں دفتر سے باہر جانے کے لئے کہہ دیا، خالد حسین کے رویے کو سابقہ ممبر اسمبلی نے اپنی ہتک سمجھا اور ایک وفد لیکر گورنر گریش چندر سکسینہ صاحب کو ملا اور خالد حسین کے خلاف الزام لگایا کہ وہ دہشت گردوں کا سرپرست ہے اور پاکستان سے آنے والے ہتھیار اور گولہ بارود اپنی سرکاری جیپ میں اُگروادیوں تک پہنچتا ہے۔ نیز اُس کا بیٹا ملی ٹینٹ ہے اور اُسکے پاس پونچھ میں رہ رہا ہے۔ گورنر صاحب نے شکایت نامہ اپنے مشیر اور صلاح کار وید پرکاش جی کو انکوائری کیلئے بھیج دیا اور لکھا کہ ''یہ ایک سنجیدہ الزام ہے اس کی فوراً انکوائری کرائی جائے۔ تفتیش مکمل ہونے تک خالد حسین کو معطل کر کے سیکرٹریٹ میں اٹیچ کر دیا جائے۔ اُس وقت محکمہ زراعت اور دیہی ترقی کے کمشنر وجے بقایا (آئی، اے، ایس) تھے۔ اُنہوں نے خالد حسین کو شکایت بارے بتایا اور اپنے دفتر میں طلب کیا۔ خالد حسین نے وہ سارے سفارشی رقعے ساتھ لئے اور بقایا صاحب کے دفتر میں پیش ہو گیا۔ کمشنر صاحب نے وہ شکایتی درخواست خالد حسین کے سامنے رکھ دی جس پر گورنر صاحب اور اُن کے مشیر نے کاروائی کرنے کا حکم دیا تھا۔ جب وجے بقایا صاحب نے اصل معاملہ جاننا چاہا تو خالد حسین نے سارا قِصہ بیان کیا اور ثبوت کے طور پر وہ ساری پرچیاں سامنے رکھ دیں جن میں سابقہ ممبر اسمبلی نے اپنے منظور نظر ورکروں کو پنچایت کے ترقیاتی کام دینے کے لئے کہا تھا۔ جب خالد حسین اپنے کمشنر موصوف کو شکایت کنندہ کی دیگر کرتوتیں سُنا رہا تھا تو اُسی وقت پونچھ اور راجوری کے سپیشل کمشنر ڈاکٹر سُدھیر سنگھ بلوریہ اور ضلع ترقیاتی کمشنر پی، دھر چکرورتی بھی بقایا صاحب کے کمرے میں وارد ہوئے۔ جب انھیں ساری بات بتائی گئی تو دونوں نے خالد حسین کے حق میں چٹھیاں لکھیں اور بتایا کہ کس طرح سابقہ ممبر اسمبلی تمام ضلع افسروں کو بلیک میل کرتا ہے۔ اُنہوں نے خالد حسین کی ادبی اور ثقافتی سرگرمیوں کا کھُل کر ذکر کیا کہ کس طرح اُس نے نوجوان لڑکوں کو دہشت گردی سے دور رکھنے کے لئے پونچھ میلہ 1990

کروانے میں بڑھ چڑھ کر کام کیا۔کُل ہند مشاعرے کروائے۔گیت سنگیت کی محفلیں سجائیں۔وڈالی بھائیوں اور قوالن چنچل بھارتی کو پونچھ جیسے دور دراز اور پسماندہ ضلع میں پہلی بار بلایا اور اُن کے گیت سنگیت کے پروگرام کرائے۔اُنہوں نے شکایت کو ذاتی عناد، من گھڑت، جھوٹ اور انتقامی لکھا۔اِن دونوں چٹھیوں کا حوالہ دیتے ہوئے وجے بقایا صاحب نے فائل پر نوٹ لکھا اور گورنر کے مشیر وید پرکاش صاحب کو بھیج دیا۔وید پرکاش صاحب نے بھی اپنی رائے لکھ کر مسل گورنر گریش سکسینہ صاحب کو بھیج دی۔گورنر صاحب نے مسل پڑھنے کے بعد فائل بند کرنے کا حکم دیا اور یوں یہ قصہ ختم ہو گیا۔

اسی طرح جب خالد حسین جنوری 1993ء میں راجوری کے اے، سی، ڈی تھے تو ایک بد بخت حرامی نے درہال بلاک کے بی، ڈی، اور یاض زرگر کو جان سے مارنے کی دھمکی دے کر بلاک کے دو کاموں کا ورک آرڈ حاصل کر لیا تھا۔نہ تو کام مکمل ہوا تھا اور نہ ورک آڈر کے مطابق کام ہو رہا تھا بلکہ سریا اور سیمنٹ بھی بیچ دیا گیا تھا، اور پھر ایک دِن وہ غنڈہ بلاک افسر کے گھر گھس کر پستول کی نوک پر اُس سے اُن کاموں کی رقم مانگنے لگا اور چیک دستخط کرنے کیلئے ڈرانے دھمکانے لگا۔ریاض زرگر ایک شریف اور فقیرانہ طبیعت کا افسر تھا اُس نے چیک پر تو دستخط کر دیئے لیکن اُس نے وائرلیس کے ذریعہ ساری روداد خالد حسین کو بتا دی اور خود بھی دوسری صبح اُن کے سرکاری کوارٹر پر حاضر ہو کر رونے لگا خالد صاحب نے بنک منیجر کو چیک ردّ کرنے کے لئے کہا اور ریاض زرگر کو لیکر ڈی، سی، پرمود جین (آئی، اے، ایس) اور ایس، ایس، پی، فاروق احمد سے ملا اور بتایا کہ کس طرح ایک نامی غنڈے نے پستول کی نوک پر بی، ڈی، او سے چیک پر دستخط کرائے ہیں۔چیک کینسل ہو گیا۔اُس غنڈے کو رقم نہیں ملی بلکہ اُس کے خلاف ایف، آئی، آر درج ہو گئی۔اس واقعے کے بعد وہ ریاض زرگر اور خالد حسین کا جانی دشمن بن گیا اور خفیہ اداروں میں دونوں کے خلاف شکایتیں کرنے لگا کیونکہ وہ فوج کا مخبر تھا اور اُس نے کئی افسروں کا جینا حرام کیا ہوا تھا۔اُس کی غنڈہ گردی سے عام لوگ بھی تنگ تھے لیکن ڈر کے مارے بولنے سے کتراتے تھے۔یوں سمجھیں کہ وہ درہال بلاک کا اکھنوانی تھا۔اُس نے خالد اور ریاض زرگر کے خلاف فوج کی خفیہ ایجنسی کو لکھتی شکایت کی کہ یہ دونوں افسر پاکستان نواز ہیں اور معصوم بچوں کو ورغلا کر دہشت گردی کی تربیت کیلئے سرحد پار بھیجتے ہیں۔ریاست میں کام کرنے والے سبھی خفیہ ادارے حرکت میں آ گئے اور چھان بین کرنے لگے۔اسی دوران خالد حسین اور ریاض زرگر کا تبادلہ ضلع ڈوڈہ میں دوبارہ ہو گیا۔تفتیش کا سلسلہ وہاں بھی چلتا رہا کونکہ درہال کے فوجی مخبر کا ایک نزدیکی رشتے دار ڈوڈہ میں رہتا تھا اور وہ بھی بلاک افسر تھا اور اُس نے آرمی کے افسران کے ساتھ

گہرے تعلقات بنا لیے تھے۔ایک دنِ ریاض زرگر کو، جو اُس وقت گھٹ بلاک کا بی، ڈی، او تھا فوجی بریگیڈئر نے آرمی کیمپ میں بُلایا اور اُسے دھمکی دی کہ جلد اُسے اور خالد حسین کو گرفتار کر لیا جائے گا کیونکہ وہ معصوم لڑکوں کو ورغلا کر پاکستانی مقبوضہ کشمیر ٹریننگ کے لئے بھیجتے ہیں۔تین چار گھنٹے اُسے حراساں کیا گیا۔آرمی کیمپ سے ریاض زرگر سیدھا خالد حسین کے پاس آیا۔وہ گھبرایا ہوا تھا اور آتے ہی رونے لگا اور کہنے لگا کہ بریگیڈئر جیسوال نے اُسے گرفتار کرنے اور جان سے مارنے کی دھمکی دی ہے۔خالد حسین اُسے لیکر ڈپٹی کمشنر عبدالرشید پرے سے مِلا، جس نے بریگیڈئر کو خط لکھا کہ اُس نے کس حیثیت اور کس کی اجازت سے ریاض بی، ڈی او کو بلایا اور ضلع انتظامیہ کو اس کی اطلاع تک نہ دی۔ڈی، سی، صاحب کی چٹھی لیکر خالد حسین خود بریگیڈئر سے ملا اور اُسے سمجھایا کہ یہ سب ذاتی عناد کی وجہ سے ہے۔ورنہ شکایت میں کوئی سچائی نہیں ہے،لیکن بریگیڈئر جیسوال کا اصرار تھا کہ اُن دونوں نے لڑکوں کو ٹریننگ کے لئے پونچھ کے راستے سرحد پار بھیجا ہے۔جب خالد حسین نے ثبوت کے لئے پوچھا تو آرمی افسر کہنے لگا کہ اُنہوں نے بانہال میں چار لڑکے پکڑے ہیں جو پاکستان سے تربیت حاصل کر کے آئے ہیں اور انٹیروگیشن میں اُنہوں نے آپ دونوں کا نام لیا ہے۔جب خالد حسین نے اُن لڑکوں کو روبرو لانے کے لئے کہا تو اُس کا لہجہ ایک دم تبدیل ہو گیا اور وہ اناپ شناپ بولنے لگا اور اپنی وردی کا رُعب دِکھانے لگا۔خالد حسین نے اُسے بے باکی سے تبایا کہ یہ سارا معاملہ وہ ریاست کے چیف سیکریٹری کے نوٹس میں لائیں گے اُن سے گذارش کی جائے گی کہ کور کمانڈر سے التماس کی جائے کہ وہ اس سارے معاملے کی غیر جانبدارانہ انکوائری کرایں۔ڈپٹی کمشنر صاحب نے چیف سیکرٹری صاحب کو اس سلسلہ میں ایک مفصل چٹھی لکھی اور پھر ایک آدھ مہینے کے بعد بریگیڈئر جیسوال کی تبدیلی کسی اور جگہ کر دی گئی۔

پونچھ میں ہی جب خالد حسین ڈپٹی کمشنر تعینات ہوئے تو ریاستی سرکار کی طرف سے ''رہبر تعلیم'' نام کی ایک سکیم لاگو کی گئی۔ملی ٹینسی کی وجہ سے دُور دراز اور پہاڑی علاقوں کے اسکول کئی سالوں سے بند پڑے تھے کیونکہ دہشت گرد کارروائیوں کی وجہ سے ملی ٹینٹوں اور سیکورٹی دستوں اور فوج کے جوانوں کے درمیان مقابلہ آرائی معمول کی بات تھی۔پہاڑوں پر جنگجوؤں کا بسیرا تھا اور وہ فوجی کیمپوں پر حملے کرتے رہتے تھے۔جس کی وجہ سے عام لوگوں کا جانی اور مالی نقصان بہت زیادہ ہوتا تھا۔اساتذہ ڈر کے مارے سکول نہیں جاتے تھے اور سکولوں کو تالے لگے تھے۔چنانچہ سرکار کی ہدایت کے مطابق جو سکول بند پڑا تھا، وہاں اُسی گاؤں کے پڑھے لکھے نوجوان کو ٹیچر لگایا جانا تھا تا کہ

بچے تعلیم حاصل کرسکیں۔ خالد حسین ریاستی سرکار کی گائڈ لائن کے مطابق امیدواروں کا انتخاب کررہا تھا اور قابلیت کے حساب سے ٹیچروں کی لسٹ بنا رہا تھا۔ ایک بار سورن کوٹ کے ایم، ایل، اے اور وزیر مملکت مشتاق بخاری صاحب نے خالد حسین سے کہا کہ ان کی ایک رشتے دار لڑکی کو مڑھا سکول میں ٹیچر لگایا جائے۔ خالد حسین نے صاف جواب دے دیا کہ یہ ناممکن ہے کیونکہ آپ کی رشتے دار سورن کوٹ میں رہتی ہے جبکہ سکول مڑھا میں بند پڑا ہے۔ نیز گائڈ لائن کے مطابق اُسی گاؤں کا تعلیم یافتہ اُمیدوار لگے گا۔ اس انکار سے پہلے بھی ایک واقعہ ہوگذرا تھا جو ایم، ایل، اے صاحب کے چچا زاد بھائی اور سورن کوٹ کے بلاک میڈیکل افسر ڈاکٹر ممتاز بخاری سے متعلق تھا۔ اُس نے بغیر اختیارات کے 45 ناجائز تقرریاں کی تھیں۔ جن میں اپنی بیوی کو بھی مِڈ وائف کی آسامی پر لگایا تھا۔ جب یہ اطلاع خالد حسین کو ملی تو اُنہوں نے بلاک میڈیکل افسر کے دفتر کا سارا ریکارڈ ضبط کرلیا تھا۔ اور اُس کے خلاف کیس تیار کرکے خود ویجی لینس کمشنر راجندر تِکّو سے ملے تھے اور اُنھیں سارے ثبوت حوالے کئے تھے جس کی وجہ سے ممتاز بخاری کے خلاف انکوائری شروع ہوگئی تھی۔ انہی وجوہات کی بنا پر وزیر مملکت خالد حسین سے دُکھی تھے اور اُنھوں نے اُن کے خلاف ویجی لینس کمشنر کو درخواست دی اور لکھا کہ رہبرِ تعلیم کے تحت جو استاد لگائے گئے ہیں۔ اُس میں خالد حسین نے فی اُمیدوار بیس ہزار روپئے رشوت لی ہے۔ دوسرا الزام یہ لگایا کہ انہوں نے ملی ٹینٹوں کو بندوق کے لائسنس جاری کئے ہیں جس کے لئے کرائم برانچ نے انکوائری شروع کردی۔ اپنے دو ورکروں کے ذریعے ہائی کورٹ میں خالد حسین کے خلاف رشوت لینے اور اساتذہ کو بھرتی کرنے میں بے ضابطگیوں کے الزام میں مقدمہ شروع کروادیا یعنی ایک غلط کام نہ کرنے کا خمیازہ تین تین جگہ بھگتنا پڑا۔ ایسی ہی درخواستیں ڈائریکٹر جنرل پولیس گوربچن جگت اور چیف سکریٹری صاحب کو بھی بھیجی گئیں۔ ملی ٹینٹوں کا حمایتی اور اُنھیں گن لائسنس جاری کرنے کے الزامات بڑے تشویش ناک تھے۔ گوربچن جگت جی نے ہریانہ سے پولیس کی ایک خصوصی ٹیم منگوائی اور اس سارے معاملے کی خفیہ تفتیش کرائی۔ تقریباً ایک مہینے کے بعد وہ ٹیم واپس چلی گئی۔ لیکن ایس، ایس، پی پنکج سکسینہ اور ڈی، ایس، پی ہیڈکوائرٹر جناب سردار خان نے خالد حسین کو بتایا کہ ہریانہ سے ایک پولیس ٹیم آئی تھی جو اُن کے بارے میں انکوائری کررہی تھی اور وہ ٹیم مطمئن ہوکر گئی ہے۔ ہائی کورٹ نے بھی کیس خارج کرتے ہوئے اپنے فیصلے میں لکھا کہ اُمیدواروں کو منتخب کرنے میں شفافیت سے کام لیا گیا ہے۔ دس پندرہ دِنوں کے بعد چیف سیکریٹری صاحب نے خالد حسین کو بُلایا اور اُن کے کام کی تعریف کرتے

ہوئے کہا کہ اس طرح کی الزام تراشیاں ملازموں پر لگتی رہتی ہیں لیکن ایمان داری اور ضابطے کے مطابق اپنی ڈیوٹی سرانجام دینے والوں کو صرف اپنے مالک سے ڈرنا چاہئے۔ ڈاکٹر گوربچن جگت جی نے بھی اُن کے کام کو سراہا۔

2005 میں جب خالد حسین پاکستانی انتظام والے کشمیر کا دورۂ کر کے واپس آئے تو سری نگر کے وائی اڈے پر سابقہ آئی، اے، ایس افسر گوہر احمد نے اُن سے پوچھا کہ وہ اب کب جینوا اور ویانا جا رہے ہیں۔ خالد حسین نے جواباً کہا کہ اُنہیں وہاں کون لے جائے گا تو گوہر احمد نے کہا آئی، بی والے۔ کیونکہ وہ اُن کا ایجنٹ ہے۔ جب خالد حسین نے کہا کہ گوہر صاحب کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہے تو اُنہوں نے بڑے طنزیہ اور غُصیلے انداز میں بات کرتے ہوئے کہا کہ انھیں کوئی غلط فہمی نہیں ہے کیونکہ آزاد کشمیر میں دیئے گئے اُن کے بیانات ثبوت کے لئے کافی ہیں۔ اس سب کے باوجود خالد حسین نے کبھی کسی کا بُرا نہیں چاہا۔ کبھی کسی کے لئے دل میں کوئی رنجش نہیں رکھی۔ جب میرے سالے کوشل کمار شرما کا انٹرویو (Viva) تھا تو میں اُن کے پاس گیا تا کہ وہ پبلک سروس کمیشن کے چیئرمین سید اختر مرتضیٰ صاحب سے کوشل کی سفارش کریں کیونکہ اختر صاحب اور خالد حسین میں دوستانہ تعلق تھا۔ اس طرح خالد حسین کے ریڈر گھنشام سنگھ نے بھی کشمیر ایڈمنسٹریٹو سروس کا امتحان پاس کیا تھا لیکن اُسے خدشہ تھا کہ Viva میں اُسے فیل نہ کر دیں۔ اس لئے خالد حسین نے اُس کی بھی سفارش کی۔ پبلک سروس کمیشن کے دوسرے ممبر سرن سنگھ خالد حسین کے ادیب دوست تھے۔ خالد صاحب گھنشام کو لیکر دونوں کے پاس گئے۔ خدا کی مرضی اور اُن کا مقدر کہ دونوں منتخب ہو گئے۔ کوشل کے پی، ایس میں اور گھنشام کے، اے، ایس میں آ گیا۔ گھنشام سنگھ دو بار پہلے Viva میں فیل ہو چکا تھا۔ سید اختر مرتضیٰ صاحب دِلدار انسان تھے اور یاروں کے یار۔ وہ آج اس دُنیا میں نہیں ہیں لیکن اُن کے لگائے ہوئے دونوں پودے آج تناور درخت بن چکے ہیں۔ خالد حسین نے کبھی دھرم رنگ، نسل، ذات برادری یا زبان کی وجہ سے کسی کے ساتھ بے انصافی نہیں کی ہمیشہ غریبوں کی مدد کی۔ کیونکہ انہوں نے خود غربت دیکھی تھی۔ پرماتما اُنہیں شانتی دے ؎

مخالفت سے میری شخصیت سنورتی ہے
میں دُشمنوں کا بڑا احترام کرتا ہوں

(بشیر بدرؔ)

خود فریبی سی خود فریبی ہے

یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے
ہوئے تم دوست جس کے اُس کا دشمن آسماں کیوں ہو (غالبؔ)

خالد حسین جوانی میں قدرے جذباتی اور غُصیلی طبیعت رکھتا تھا۔ وہ نہ تو غلط بات کرتا اور نہ ہی سُنتا تھا۔ جوانی کے اُن ہی جوشیلے دِنوں میں جب 1965ء کی بھارت پاک جنگ عروج پر تھی تو ہندو کٹّر پنتھی لیڈر بھارتی مسلمانوں کو دھمکیاں دے رہے تھے۔ جن سنگھ (بھارتیہ جنتا پارٹی) اور اُس کے نظریاتی گورو راشٹریہ سیوک سنگھ کے لوگ مسلمانوں کو پاکستانی، غدار، اور بھارت وِرودھی کہتے تھے (بالکل آج کی طرح) یہ بات مسلمانوں کو کانٹوں کی طرح چبھتی تھی لیکن اقلیت میں ہونے کی وجہ سے وہ اکثر ڈرے سہمے رہتے اور اکثریت کی نفرت، الزام تراشیوں اور طنزیہ باتوں کا جواب نہیں دیتے تھے۔ جنگ ختم ہوئی تو بھارتی اخباریں، پاکستان کی ہار، اُس کی فوجوں کو خاک چٹانے اور سبق سکھانے والی خبروں سے بھری ہوتیں جبکہ حقیقت شادیانے بجانے والی نہیں تھی۔ 1965ء کی جنگ فیصلہ کُن نہیں تھی۔ ہندوستانی فوج کے اُس وقت کے سربراہ جنرل جے، این چوہدری کے بقول یہ لڑائی ماسوائے گولہ بارود ضائع کرنے کے علاوہ بے نتیجہ رہی تھی۔ دونوں ملکوں نے جیتے ہوئے علاقے اور جنگی قیدی واپس کر دیئے تھے۔ اپنی کتاب "The brave deeds of Indian Jawans." میں اُنہوں نے لکھا تھا کہ دونوں فوجیں انگریز کی تربیت یافتہ تھیں۔ لہٰذا ایک دوسرے کے داؤ پیچ سے واقف تھیں۔ جنگی چالوں میں ماہر تھیں۔ بھارتی فوجیں سیالکوٹ لاہور، نارووال اور شکر گڈھ کے اندر گھس گئی تھیں اور تقریباً پانچ سو گاؤں پر قبضہ کر لیا تھا۔ لاہور میں تو اچھوگل نہر تک بھارتی فوجیں پہنچ گئی تھیں۔ ساتھ میں جموں و کشمیر میں حاجی پیر کی پہاڑی پر بھی قابض ہو گئی تھیں جبکہ پاکستانی فوج چھمب جوڑیاں پر قبضہ کر کے اکھنور پُل سے صرف پانچ کلومیٹر دور تھی۔ واہگہ کھیم کرن اور فاضلکا کے کچھ گاؤں پر قبضہ کرنے کے بعد پاکستانی فوج راجستھان کے باڑمیر، جیسلمیر کے تقریباً ہزار مربع کلومیٹر کے ریگستانی علاقہ پر قابض ہو گئی تھی۔ گو کہ فوجی اعتبار سے یہ علاقہ کوئی اہمیت نہیں رکھتا تھا لیکن تاشقند معاہدہ ہوتے ہی دونوں ملک اپنی اپنی سرحد کے اندر آ گئے تھے۔ اس کے باوجود ہماری اخباریں شہ سُرخیاں لگا رہی تھیں۔ حقیقت بیان کرنے کے لئے خالد حسین نے ایک

مضمون لکھا جو دہلی اور جالندھر سے شائع ہونے والے اُردو اور ہندی اخبار ''پرتاپ'' میں چھپا۔ جس میں بین الاقوامی فوجی ماہرین کے اعداد وشمار دیئے گئے تھے جو اُنہوں نے ہند۔ پاک جنگ کے حوالے سے شائع کئے تھے۔ پھر 1972ء کے اختتام پر راشٹریہ سیوک سنگھ کے پردھان گورو گولوالکر جی سری نگر آئے اور شیتل ناتھ مندر میں ہندو بھگتوں سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ بھارت صرف ہندوؤں کا دیش ہے۔ مسلمان بھارت سے نکل جائیں اور پاکستان چلے جائیں یا عرب ملکوں میں ورنہ اُنھیں عرب مہاساگر میں پھینک دیا جائے گا۔ وہ بیان دے کر ناگپور چلے گئے لیکن کشمیر میں بوال کھڑا ہو گیا۔ ہڑتال کی کال دی گئی۔ دُکانیں بند ٹرانسپورٹ بند اور جلسے جلوس شروع ہو گئے۔ نعرے لگنے لگے ''انڈین ڈاگز گو بیک'' بہت دِنوں تک کشمیر کی مذہبی اور سیاسی ہانڈی اُبلتی رہی۔ بڑی مشکل سے ریاستی سرکار نے حالات پر قابو پایا۔ مسلمانوں کو پاکستان بھیجنے یا بحرۂ عرب میں پھینکنے کے بیانات جن سنگھ اور آر۔ ایس۔ ایس کے کئی دیگر لیڈران بھی وقتاً فوقتاً دیتے رہے۔ ان بیانات سے دُکھی ہو کر خالد حسین نے ایک آرٹیکل لکھا، عنوان تھا، ''ہندوستانی مسلمان ایک سوال ایک جواب'' یہ آرٹیکل سب سے پہلے روز نامہ ''ملاپ'' جالندھر کے دسمبر 1972ء کے شمارے میں چھپا تھا اور پھر یہی مضمون مولوی عباس انصاری صاحب نے 1973ء میں اپنے ماہنامہ ''سفینہ'' میں چھاپا تھا۔ اس مضمون میں خالد حسین نے سندھو تہذیب سے متعلق تاریخی حوالہ جات سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ ہندوستان کئی قوموں، نسلوں اور مذہبی عقیدوں کے ماننے والوں کا ملک ہے۔ ہم سب کا نسلی تعلق مقامی آریائی اور درد گروپ سے ہے۔ اس سے پہلے شمالی ہندوستان میں دراوڑ نسلی گروپ رہتا تھا یہاں، ہندو، جین، بدھ پھر ہندو مسلمان اور عیسائی مذاہب کا غلبہ رہا۔ بدھ مت یا گندھارا تہذیب و تمدن نے تو اڑھائی ہزار سال تک ہندوستان کو اپنے زیر اثر رکھا۔ نالندہ اور ٹیکشلا کے آثار اس بات کا ثبوت ہیں۔ پنجاب، کشمیر، صوبہ سرحد، افغانستان، انڈونیشیا، چین، منگولیا اور وسط ایشیاء کے ممالک میں گندھارا تمدن ہر جگہ آج بھی موجود ہے۔

گندھارا تہذیب سے پہلے مہر گڑھ (9 ہزار سال پُرانی تہذیب، پاکستان) بسّی (7 ہزار پرانی تہذیب پاکستان) موہن جو دوڑو (5 ہزار سال پُرانی تہذیب، پاکستان) ہڑپہ، (5 ہزار سال پُرانی تہذیب، پاکستان) راکھی گڈھ (5 ہزار سال پرُانی تہذیب، ہریانہ) بھارت کے آثار دیکھ کر پتہ چلتا ہے کہ آریہ لوگ یا تو ہجرت کر کے سندھو گھاٹی میں آئے یا یہیں کے ہی مقامی لوگ تھے۔ بال گنگا دھر تلک نے اپنی کتاب Arctic Home in the vedas جو 1903 میں چھپی، میں

لکھا ہے کہ آریہ نارتھ پول سے ہجرت کر کے سنٹرل اشیا سے ہوتے ہوئے ہندوستان آئے۔ یہی تھیوری گورو گولوالکر کی بھی ہے جو اُنہوں نے اپنی کتاب we or our nation hood میں لکھی ہے۔ جو 1939ء میں چھپی اور وہ بھی مانتے ہیں کہ آریہ لوگوں نے ہجرت کی اور ہندوستان میں آباد ہوئے۔ لیکن جو انسانی پنجر (کنکال) راکھی گڈھ اور مہر گڈھ میں برآمد ہوئے ہیں، اُن سے پتہ چلتا ہے کہ یہ پنجر مقامی لوگوں کے ہیں۔ اصل باشندے شکار کر کے اپنا جیون گذارتے تھے جن کو شمالی ہندوستان سے کھدیڑ کر جنوب کی طرف دھکیل دیا گیا۔ خاص کر انڈومان اور نکوبار میں جہاں آج بھی یہ لوگ آباد ہیں۔ ہڑپن تہذیب کے لوگ جنوب میں آباد ہیں۔ اگر یہ تھیوری مان لی جائے تو پھر ہم سب کو شمالی ہندوستان کو چھوڑ دینا چاہئے۔ اسلام کی عمر تو محض 15 سو سال کی ہے۔ جبکہ کشمیر میں اسلام نے سب سے آخر میں یعنی چودھویں صدی عیسوی میں دستک دی اور وہاں کی 95 فید مقامی آبادی مشرف بہ اسلام ہوئی۔ ہندوستان میں سب سے پہلے مسلمان تاجر (عرب) کیرالا کی موپلا بندرگاہ پر ساتویں صدی عیسوی میں اُترے۔ محمد بن قاسم عرب حملہ آور 712 عیسوی میں سندھ کے ساحل پر اُترا اور سندھ اور ملتان پر قبضہ کیا۔ پھر مسلمان صوفی دسویں اور گیارہویں صدی میں آئے۔ اگر تلک اور گولوالکر صاحب کی تھیوری کو مان لیا جائے تو پھر ہندوؤں کو بھی بھارت چھوڑ کر اپنے ہزاروں سال پرانے علاقوں میں واپس چلے جانا چاہئے اور یہاں کے اصل باشندوں یعنی دراوڑوں کو پاکستان سمیت پورا شمالی ہندوستان دے دینا چاہئے۔ اِس لئے ہمارے مذہبی اور سیاسی لیڈروں کو یہ بات سمجھ لینی چاہئے کہ، ہندو، مسلمان، سکھ یا عیسائی اور بُدھ بننے سے نسل نہیں بدلتی۔ ساجھا ورثہ، زبان اور رہن سہن نہیں بدلتا۔ آپ برصغیر ہندوستان کے مسلمانوں اور ہندوؤں کا ڈی، این، اے ٹسٹ کرایں تو سب کا خُون ایک ہی نسل ہونے کو ثابت کرے گا۔ اس لئے برصغیر کے مسلمانوں کو بھی آریہ ورت کے پریوار کا اٹوٹ انگ مان لینا چاہئے۔ رہی بات پاکستان بننے کی یا بنانے کی تو اس کے لئے سبھی برابر کے ذمہ دار ہیں۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی تعلیمی اور معاشی پسماندگی، غربت اور جہالت بھی دیش کی تقسیم کے لئے ایک وجہ تھی۔ برصغیر ہند کی تقسیم کے لئے جہاں قائداعظم محمد علی جناح کو مورد الزام ٹھہرایا جاتا ہے وہاں پنڈت نہرو اور سردار پٹیل کا رول بھی مثبت نہیں رہا، اور یہ سب تقسیم کے فارمولے کو حتمی شکل دینے میں شریک تھے۔ مان لیں کہ دوقومی نظریے کی بنیاد پر محمد علی جناح نے دیش کی تقسیم کرائی لیکن دیش کو آزادی دِلانے والے مہاتما گاندھی تو آخری دم تک تقسیم کے خلاف تھے اور وہ نتھو رام گوڈسے کے فلسفے کو یکسر رد کرتے ہوئے ہندو اور مسلمانوں کو بھائیوں کی طرح رہنے کے لئے

کہتے رہے لیکن ہندو مسلم بھائی چارہ کا نعرہ ہی اُن کی شہادت کا کارن بنا۔ پھر اس بات پر بھی غور کرنے کی ضرورت ہے کہ اسلام اور مسلمانوں کے نام پر بننے والا پاکستان 25 سال کے اندر ہی دو پھاڑ کیوں ہو گیا اور برصغیر کا یہ دوسرا بٹوارہ کس نے کرایا اور کیوں کرایا۔ اور تیسرا ملک کیسے وجود میں آیا۔ اصل میں دھرم کبھی بھی انسانوں کو جوڑنے کا کام نہیں کرتا۔ بلکہ زبان کلچر، نسل اور تہذیب وہ مضبوط اکائیاں ہیں جو دُنیا کے ممالک میں انسانوں کو جوڑنے کا کام کرتی ہیں۔ ایران، افغانستان، عراق، سعودی عرب، سنٹرل ایشیا کے مسلم ممالک سب کی اپنی اپنی زبانیں ہیں۔ اپنا کلچر ہے۔ اپنی اپنی خوراک ہے، رہن سہن ہے۔ اسی طرح ہندوستان میں بھی مسلمانوں کے علاوہ بُدھ، جین، عیسائی، سکھ اور پارسی وغیرہ کا اپنا اپنا کلچر ہے۔ کشمیر میں رہنے والے ہندوؤں اور مسلمانوں کی مادری زبان ایک ہے۔ اسی طرح یوپی، پنجاب، ہریانہ، راجستھان، بہار، گجرات یعنی سبھی ریاستوں میں رہنے والے ہندوؤں، مسلمانوں، عیسائیوں،، بودھوں اور سکھوں وغیرہ کی اپنی اپنی مادری زبانیں ہیں ماسوائے دھرم کے باقی اُن میں کچھ بھی الگ نہیں ہے۔ لہٰذا مذہب کے نام پر نفرت پھیلانا چھوڑ دیں۔ ہمارا ملک خوبصورت پھولوں کا ایک باغ ہے۔ اس کو اُجاڑنے کی بجائے مزید خوبصورت بنایا جائے۔ سیاست کے لئے مذہب کو استعمال نہ کیا جائے۔ جیسا کہ آج کل ہو رہا ہے۔ مذہبی منافرت تباہی لائے گی۔ انارکی پھیلائے گی۔ جس کا فائدہ دشمن دیشوں کو ہوگا۔ اس لئے سیاسی، سماجی، مذہبی لیڈروں، مولویوں، پجاریوں اور سوامیوں کو نفرت پھیلانے والی باتوں سے پرہیز کرنا چاہئے۔ خالد حسین کا مضمون جو ''سفینہ'' میں چھپا تھا۔ میرے پاس آج بھی محفوظ ہے۔ میرا نام اشتیاق حسین کاظمی ہے لیکن ادبی حلقوں میں میری پہچان خورشید کاظمی کے نام سے ہے۔ میں انڈین فارسٹ سروس کا رہٹائر افسر ہوں۔ میری آخری پوسٹنگ چیف کنزویٹر آف فارسٹ جموں تھی۔ شعر وشاعری کا شوق مجھے بچپن سے تھا کیونکہ میرے والد مرحوم سید فتح حسین شاہ کاظمی بھی شاعر تھے اور گھر کا ادبی ماحول مجھے بھی راس آ گیا تھا۔ چنانچہ میں بھی شعر کہنے لگا۔ میں جموں کی اردو ادبی تنظیم ''انجمن فروغ اُردو'' کا جنرل سیکریٹری بھی ہوں اور انجمن کی طرف سے ادبی پروگرام کروانے میں میرا اہم رول رہتا ہے۔ میں نے خالد حسین کی تقریباً سبھی اُردو اور پنجابی کہانیاں پڑھی ہیں اور میرا ماننا ہے کہ خالد حسین افسانوی ادب میں اپنی زبان بیان اور لہجے کی وجہ سے الگ پہچان رکھتے ہیں۔ اُن کی کتابوں کو پڑھ کر میں نے اُن کے فن پر انگریزی اور اُردو میں مضامین بھی لکھے ہیں۔ خالد حسین کی کہانیاں کسی خاص فرقے یا طبقے کی نمائندگی نہیں کرتیں۔ بلکہ مظلوم کی دادرسی کرتی ہیں اور ظالم کو ظلم کرنے سے

روکنے کا کام کرتی ہیں۔ وہ اپنے افسانوں میں امن شانتی اور پیار محبت کی بات کرتے تھے لیکن جب نفرت کی آگ بھڑکانے والے کٹّر وادی ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کے خلاف زہر اُگلتے ہیں تو وہ دُکھی ہوجاتے تھے۔ خالد حسین ایک بار ایسے پروگرام میں مدعو تھے، جہاں جموں کو الگ ریاست بنانے کے بارے میں مقررین کو اپنی اپنی رائے رکھنی تھیں۔ جب خالد حسین کو بولنے کے لئے کہا گیا تو اُنہوں نے مذہبی بنیاد پر جموں وکشمیر کی تقسیم کی مخالفت کی اور کہا،'' پاکستان تو مذہب کی بنیاد پر بنا تھا لیکن کیا اسلامی جمہوریۂ پاکستان میں سب ٹھیک ہے؟ کیا پاکستان مسلمانوں کی جنت بن گیا ہے؟ کیا وہاں مذہب مسلک، زبان اور علاقے کی وجہ سے فساد نہیں ہوتے ؟ کیا وہاں قرآنی ہدایات کے مطابق لوگوں کو انصاف مل رہا ہے؟ شیعہ سنی، بریلوی، دیوبندی، سندھی، مہاجر، پنجابی، پٹھان، بلوچی اور سرائیکی کے نام پر فساد نہیں ہوتے ؟ ہر مسلک والا دوسرے کو کافر نہیں کہتا ؟ کیا وہاں اسلامی تعلیمات کے مطابق نظام چل رہا ہے؟ اسی طرح کیا دیگر مسلم ممالک میں بھی اسلامی اصولوں کے مطابق کارِسرکار چلتا ہے۔ نہیں، بالکل نہیں، کیوں کہ زبان اور کلچر انسانوں کو جوڑتا ہے۔ اس لئے ہندو اکثریت اور مسلم اکثریت کے نام پر ریاست کے ٹکڑے نہیں ہونے چاہئیں۔ ہندوستان کے آئین میں اور ملک کے سیکولر ڈھانچے میں اس کی کوئی گنجائش نہیں ہے، ہمارے مرکزی سیاست دانوں کا موقف ہے کہ ریاست جموں وکشمیر بھارت کا اٹوٹ انگ ہے تو اس اٹوٹ انگ کو توڑنا کہاں کی عقلمندی ہے۔ جو لوگ جموں کو زبان اور کلچر کے نام پر الگ صوبہ بنانا چاہتے ہیں اُن کو یہ بات پلے باندھ لینی چاہئے کہ جموں میں رام بن، ڈوڈہ اور کشتواڑ (چناب ویلی) اور پونچھ، راجوری (پیر پنچال ویلی) مسلم اکثریتی علاقے ہیں جہاں کا کلچر اور بولی الگ ہے۔ گوجر بکروال گوجری زبان بولتے ہیں۔ پونچھ اور راجوری کے پہاڑی علاقوں میں پہاڑی زبان بولی جاتی ہے جبکہ رام بن، ڈوڈہ اور کشتواڑ اور ریاسی کے پہاڑی علاقوں میں کشمیری اور سراجی بولیاں بولی جاتی ہیں۔ جو ہندو بھائی، اپنی اکثریت کے بل بوتے پر الگ ریاست چاہتے ہیں وہ دراصل ڈکسن پلان کی حمایت کرتے ہیں۔ جس کے مطابق دریائے چناب دونوں ملکوں کے درمیان قدرتی سرحد بنانے کی سفارش کی گئی تھی۔ اس کا فائدہ جموں کے عوام کو نہیں بلکہ سیاسی طور پر پاکستان کو ہوگا۔ اِس لئے ریاست کو متحد رہنا چاہئے۔ ہر خطے کو اُس کی آبادی کے مطابق رقوم ملنی چاہئیں۔ تاکہ اقتصادی نابرابری کا سوال نہ اُٹھایا جاسکے جب کہ میری نظر میں ایسا بالکل نہیں ہے، کیونکہ مرکزی منصوبہ بندی کمیشن پیسے کی تقسیم برابری کی بنیاد پر کرتا ہے۔ ہاں ! سیاسی نابرابری کے احساس پر سرکار کو توجہ دینی چاہئے۔ لیکن 2014ء کے بعد

مرکزی حکومت میں جو تبدیلی آئی۔ اس نے تو یہ احساس ختم کرنے کے لئے ضروری قدم اُٹھانے شروع کر دیئے ہیں۔ اور بالآخر 5/اگست 2019 کو دفعہ 370 بھی ختم کر دی گئی۔ اور 35۔اے بھی اور جموں کشمیر کو ریاست کے بدلے مرکزی علاقہ بنا دیا گیا ہے۔ اسی طرح لداخ کو بھی مرکزی علاقے میں تبدیل کر دیا گیا ہے اور مہاراجہ گلاب سنگھ کے جموں و کشمیر کو توڑ پھوڑ دیا ہے۔ لیکن بات پھر بھی نہ بنی۔ بے اطمینانی اور بداعتمادی اُسی طرح قائم ہے۔ کشمیریوں میں یہ گہرا تاثر پایا جاتا ہے کہ انھیں کبھی بھی اپنی پسند کی سرکار بنانے کی اجازت نہیں دی گئی۔ یہاں کی حکومت اور وزیر اعلیٰ ہمیشہ ''میڈ اِن انڈیا'' ہی رہا۔ جبکہ جموں والوں میں یہ احساسِ کمتری ہے کہ 70 سالوں سے ریاست پر کشمیری سیاست دانوں کا غلبہ رہا ہے۔ یہی سوچ لداخ کی بھی تھی۔ خیر اب ہمیں اُمید کرنی چاہئے کہ مرکزی علاقے بنانے سے شاید سیاسی حالات میں بہتری آئے گی۔ جس کی اُمید بہت کم دکھائی دیتی ہے۔ کشمیر کے حالات تو جوں کے توں دِکھائی دیتے ہیں۔ لیکن جموں میں مرکزی سرکار کے فیصلے کے خلاف منفی آوازیں اُبھر رہی ہیں، کیونکہ جو بھی باہر والا زمین، جائیداد خریدے گا یا کاروبار کرے گا، یا کارخانے لگائے گا۔ وہ جموں، کٹھوعہ، سانبہ اور اُدھم پور کے علاوہ کہیں اور نہیں جائے گا۔ جبکہ مقامی لوگ بے روزگار اور بے گھری کا شکار ہوں گے۔ ایسا جموں کے بیشتر لیڈر کہہ رہے ہیں اور عوام میں بے چینی پھیلا رہے ہیں۔''

خالد حسین کے خیالات سے مجھ جیسے کئی بزرگ اور تعلیم یافتہ بے روزگار نوجوان بھی متفق تھے۔ جو لوگ پچھلی کئی دہائیوں سے جموں کو الگ ریاست بنانے کی تحریک چلا رہے تھے وہ یونین ٹیرٹری بنائے جانے کے فیصلے کے خلاف کُھل کر بیانات دے رہے تھے۔ خالد حسین کے مضامین اور افسانے ملک اور بیرون ملک چھپتے رہتے تھے۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن کا وہ ایک جانا پہچانا نام تھے۔ اُن کے ریڈیائی، اخباری اور ٹیلی ویژن انٹرویو ہندوستان اور پاکستان میں چھپتے اور نشر ہوتے رہتے تھے۔ گھریلو محاذ پر بھی خالد حسین نے کامیابی سے اپنی ذمے داریاں نبھائیں۔ بہن بھائیوں کی مدد کی۔ اُن کا ہر طرح سے خیال رکھا۔ خُداوند برحق کی حمد و ثنا سے لبریز گائتری منتر اور قرآن پاک کی سورۂ رحمن کو وہ انسانوں کے لئے پند و نصیحت کا خزانہ سمجھتے تھے۔ وید، پران، اُپنشد، سامی کتابیں، سنت، رِشی منیوں اور صوفیائے کرام کا کلام اُن کے لئے انسان کو انسان سے محبت کرنے کا پیغام تھا۔ کائنات اُن کا گھر تھا اور مخلوقِ خدا اُنکی ہم مذہب تھی۔ دھرم کو ذاتی اور سیاسی فوائد کے لئے استعمال کرنے کو وہ گناہ سمجھتے تھے۔ اُن کا کہنا تھا کہ سامراجیت کی بربریت نے دُنیا کو ایک خاردارِ جنگل بنا

دیا ہے۔خود پرستی منافرت، عداوت اور جنونی سیاست نے ہر طرف تباہی مچائی ہوئی ہے۔بھگوان کے مندر اور خدا کے گھر خوف و ہراس کے مرکز بن گئے ہیں۔حیوانی اور جنونی نظریات کا اظہار کھلم کھلا ہو رہا ہے۔نام نہاد جمہوریت کھوکھلا سیکولرازم اور کمزور قانون انسانی ذہن و دل کے لئے ناسور بن چکے ہیں۔اُن کے افسانوں میں آج کے عہد کا المیہ ملتا ہے۔ملک کی تقسیم کے زخم ملتے ہیں۔بھارت اور پاکستان کی دائمی رنجش کی وجہ سے کشمیر میں پھیلی تباہی اور بدامنی کی داستانیں ملتی ہیں وہ کہتے تھے کہ زمین کبھی تقسیم نہیں ہوتی البتہ اس کو تقسیم کرنے والے صفحۂ ہستی سے مٹ جاتے ہیں۔وہ ہندوستان اور پاکستان میں امن اور دوستی کے خواہاں تھے۔وہ طالبانی نظریاتی اسلام اور بجرنگی اور ترشُولی دھرم کی بجائے سنتوں اور بھگتوں کا ہندو دھرم چاہتے تھے۔صوفیوں اور درویشوں کا اسلام چاہتے تھے۔خداوند کریم اُن کی روح کو سکون بخشے۔

باغباں تُو نے اگر اپنی روش نہ چھوڑی
خوش نما پھولوں کا گلدستہ بکھر جائے گا

صدق، صبُوری، کلمہ پاک

گئے دِنوں کا سراغ لے کر کِدھر سے آیا کِدھر گیا وہ
عجیب مانوس اجنبی تھا مجھے تو حیران کر گیا وہ (ناصر کاظمی)

1978ء بیچ کا سب سے کم عمر انڈین ایڈمنسٹریٹو سروس کا افسر محمد اقبال کھانڈے تھا۔وہ شکل اور عقل میں بے مثال تھا۔اُس کا من میٹھے پانی کا چشمہ تھا اور میٹھے پانی کی فطرت میں کوئی فرق نہیں پڑتا کہ اُسے سونے چاندی کے برتن میں رکھا جائے یا مٹی کے مٹکے میں۔اُس کا دِل پارسا تھا۔وہ مکر و فریب کی دکانیں چلانے والے لوگوں کو ناپسند کرتا تھا۔وہ تُرش رو نہیں تھا۔اسی لئے اُس کی باتوں کا شہد میٹھا ہوتا تھا۔وہ خود غرض اور پاکھنڈیوں سے دُور بھاگتا تھا لیکن پُرخلوص دوستوں کو گلے لگاتا تھا۔وہ خوش نما، خوش اخلاق اور خوش گلو تھا۔اُس کے من کی خوبصورتی کا اعتراف اُس کے نکتہ چیں بھی کرتے تھے۔ایمانداری اور دیانتداری میں وہ یکتا تھا۔بے خوفی اور بے باکی اُس کا شیوہ تھا۔خالد حسین کے ساتھ اُس کی پہلی ملاقات 1985ء میں ہوئی جب خالد ضلع ڈوڈہ کا پروجیکٹ افسر، ضلع

ترقیاتی ایجنسی تعینات ہوا اور اقبال کھانڈے وہاں بطور ڈپٹی کمشنر اپنے فرائض انجام دے رہا تھا۔ چوں کہ ضلع ترقیاتی ایجنسی کا چیئرمین بھی ڈپٹی کمشنر یا ضلع ترقیاتی کمشنر ہی ہوتا ہے، اس لئے خالد حسین کو ضروری احکامات لینے کے لئے اقبال کھانڈے کے پاس تقریباً ہر زور جانا پڑتا۔ اقبال کی طبیعت میں رومانیت تھی۔ اُسے اچھی شاعری سے اُنس تھا۔ اچھے سنگیت کا وہ رسیا تھا خاص کر کشمیری، موسیقی کا وہ دلدادہ تھا اور اکثر اپنی خوبصورت آواز میں کشمیری گلوکاروں کے گائے ہوئے نغمے سناتا۔ وہ ادیبوں، شاعروں اور فنکاروں کی بڑی۔ عزت کرتا۔ اُسے بہن تنویر جہاں نے بتایا تھا کہ خالد حسین پنجابی اور اردو کا افسانہ نگار ہے اور اُس کی تخلیقات ہندوستان اور پاکستان کے ادبی جریدوں میں چھپتی رہتی ہیں تو اُن دونوں میں قربتیں بڑھتی گئیں۔ اقبال کھانڈے محفل پرست تھا اور پُرخلوص یاروں کا یار۔ تقریباً ہر شام اُس کی سرکاری رہائش گاہ پر دوستوں کی محلفیں لگتیں۔ جس میں جام و مینا کے دور چلتے اور اقبال کھانڈے سُرور میں حبہ خاتون، مہجور، دینا ناتھ نادم، احد زرگر اور غلام نبی ڈولوال کشتواڑی کے گیت گاتا۔ ہندی فلموں کے نغمے اور غزلیں بھی گاتا۔ اکثر اپنی دلکش آواز میں پاکستانی شاعر کی یہ نظم سناتا۔

اب کے سال پُونم میں جب تُو آئے گی ملنے
ہم نے سوچ رکھا ہے رات یوں گذاریں گے
دھڑکنیں بچھا دیں گے شوخ تیرے قدموں میں
ہم نگاہوں سے تیری آرتی اُتاریں گے
اب کے سال پُونم میں جب تُو آئے گی ملنے

پوری محفل پر مستی چھا جاتی۔ دن کو دفتر میں ڈٹ کر کام کرنا۔ عوامی وفود سے ملنا۔ اُن کے جائز کاموں کے لئے افسروں کو ہدایات دینا، ضلعی افسروں کی میٹنگیں کرنا۔ دُور دراز پہاڑی اور پسماندہ علاقوں کا دورہ کرنا اور نادار لوگوں کی دادرسی کرنا اور شام کو رنگ و نور کی محفل سجانا۔ اقبال کھانڈے شاید پہلا ڈپٹی کمشنر تھا۔ جس نے دو بار پاڈر کا پیدل سفر کیا اور ایک بار مڑھوا اور واڑون کا تین روزہ پیدل دورہ کیا۔ پھر واڑون سے مرگن پہاڑ کو پار کر کے ضلع اننت ناگ کے آخری گاؤں لہنون تک پیدل گیا۔ اہم محکموں کے ضلع افسران اُس کے ہر دورے میں ساتھ ہوتے۔ خالد حسین پر اُس کی نظر عنایت زیادہ رہتی کیونکہ وہ ہر دورہ کے دوران اُس کا ہمسفر رہتا۔ اقبال کی میز پر جو بھی مِسل آتی، وہ اُسی وقت اُس کا نپٹارا کر دیتا۔ اُس کی میز ہمیشہ خالی ہوتی۔ وہ دفتر سے تب تک باہر نہیں

نکلتا جب تک کہ ساری فائلیں نہ دیکھ لیتا۔ سوم رس پینے کے باوجود اُس نے کبھی شراب کو اپنے حواس پر سوار نہیں ہونے دیا بلکہ خماری میں اُس نے عوام کے حق میں بہترین فیصلے کئے جس کی وجہ سے وہ لوگوں میں ہر دلعزیز تھا۔ کیونکہ اقبال کھانڈے کی وجہ سے اُن کا کام کبھی نہیں رُکتا تھا بشرطیکہ وہ جائز ہو۔ اُس نے اپنے پورے سروس کیئر یر میں کبھی کوئی غلط کام نہیں کیا، چاہے کتنا بھی سیاسی یا سماجی دباؤ کیوں نہ ہو۔ مال و دولتِ دُنیا اور رشتے ناطے اُس کے فرائض میں کبھی حائل نہیں ہوئے۔ 1987ء کے ریاستی انتخابات میں بطور ڈسٹرکٹ الیکشن افسر اس نے کسی کی بھی سفارش کو نہیں مانا اور اپنی مرضی کے مطابق پولنگ اور پرزائیڈنگ افسر تعینات کئے۔ ایک تحصیل یا بلاک میں کام کرنے والے ملازموں کو دوسری تحصیل اور بلاک میں الیکشن ڈیوٹی پر لگایا، جس کی وجہ سے سیاسی لیڈر اور امیدوار اُس سے بدظن ہو گئے لیکن اُس نے شفافیت سے الیکشن کروایا اور پھر وہی اُمیدوار اُس کے گن گانے لگے جو الزامات لگا رہے تھے۔ 1987ء کے الیکشن کے بعد اُس کا تبادلہ بطور ڈائریکٹر سکول ایجوکیشن کشمیر کر دیا گیا۔ چارج لیتے ہی اقبال نے ٹیچرز کی اٹیچمینٹ ختم کر دی۔ جس کا اثر تقریباً پانچ سو اُستانیوں پر پڑا جو بڑے افسروں کی بیویاں، بہنیں یا بیٹیاں تھیں۔ بہت ہنگامہ ہوا لیکن اقبال اپنے فیصلے پر ڈٹا رہا اور کوئی سفارش نہیں سنی۔ پھر اُس نے اخباروں میں اشتہار چھپوایا اور لکھا کہ جو ٹیچر کبھی بھی اپنی تحصیل میں ڈیوٹی نہ دے سکا ہو اور وہاں جانا چاہتا ہو، وہ درخواست دے۔ اسی کے ساتھ اُن اساتذہ کی فہرست بنائی گئی جو دس یا اُس سے زیادہ عرصہ تک ایک ہی سکول میں تعینات تھے اور پھر آٹھ ہزار کے قریب اساتذہ کو تبدیل کر دیا گیا۔ جس میں اقبال کی اپنی والدہ بھی شامل تھی۔ جو تقریباً بیس سالوں سے ایک ہی سکول میں ڈیوٹی دے رہی تھی۔ اقبال بڑا اصول پرست تھا۔ اُس نے کبھی حالات سے سمجھوتہ نہیں کیا۔ آئی، اے، ایس میں آنے کے بعد اقبال نے پہلا پنگا غلام محمد شاہ المعروف گل شاہ سے لیا جو 1985ء میں وزیر اعلیٰ تھا۔ ڈریس کوڈ پر گل شاہ نے اقبال کو شدھ کشمیری مغلظات سے جب نوازا تو اقبال کھانڈے نے تُرکی بہ تُرکی جواب دیا اور انگریزی بلاغت کا ثبوت دیتے ہوئے چنندہ لفاظی کا استعمال کیا اور استعفیٰ لکھ کر اُس کے ہاتھ میں دے دیا۔ دوسری بار ڈاکٹر فاروق عبداللہ کی وزارت کے ایک وزیر راجندر سنگھ چپ سے کھینچا تانی ہو گئی۔ وہ اپنے ایک منظور نظر کی تبدیلی اُس کی پسند کی جگہ پر کرانا چاہتا تھا جبکہ اقبال کا کہنا تھا کہ جس جگہ وہ ملازم تعینات ہے، وہاں گئے اُسے کچھ مہینے ہی ہوئے ہیں اس لئے تبادلہ نہیں ہو سکتا۔ اس بات پر کشیدگی اتنی بڑھی کی منتری صاحب مستعفی ہو گئے۔ 1990ء میں جب مرکزی سرکار نے گورنر جگموہن کو دوسری بار جموں

وکشمیر میں تعینات کیا اور فاروق عبداللہ نے اپنی وزارت کا استعفیٰ دے دیا تو گورنر راج لگنے کے بعد عنانِ حکومت جگمو ہن کے ہاتھ میں آ گئی۔ اُس نے اُگروادیوں کو ختم کرنے کے لئے عام اور نہتے لوگوں پر بھی ظلم ڈھانے شروع کر دیئے۔ دہشت گرد اور دہشت گردی تو ختم نہ ہوسکی لیکن عام لوگ مرنے لگے۔ اُن کے گھر جلنے لگے۔ غیرت و آبرو نیلام ہونے لگی۔ سرکاری آتنک شروع ہوگیا۔ کشمیریوں کو سبق سکھانے کی باتیں گورنر صاحب کھلم کھلا کرنے لگے اور جلوسوں پر گولیاں برسائی جانے لگیں۔ یہ حالات دیکھ کر اقبال کھانڈے نے استعفیٰ دینے کا فیصلہ کرلیا۔ اُس وقت وہ ڈائریکٹر ٹورازم تھا۔ جب گورنر جگمو ہن کو خبر ملی تو اُس نے اقبال کھانڈے کے دوستوں کو بلایا اور سمجھایا کہ وہ اقبال کو استعفیٰ دینے سے روکیں۔ انل گوسوامی (آئی، اے، ایس) پرویز دیوان (آئی اے ایس) اور اقبال کی ایک صحافی دوست نے دو دِنوں کی مغز ماری کے بعد اقبال کو منالیا کہ وہ استعفیٰ نہیں دے گا ،لیکن گورنر صاحب سے کہہ دیں کہ وہ بے گناہ کشمیریوں کا قتل عام بند کریں اور اپنی کاروائیاں صرف اُگروادیوں تک محدود رکھیں تا کہ بھارت کا نام دنیا میں بدنام نہ ہو۔

ایک دِن گورنر جگمو ہن نے اقبال کو گورنر ہاؤس بُلایا اور پوچھا کہ اُس کی جگہ اگر اقبال ہوتا تو وہ کیا کرتا۔ اقبال کھانڈے جواب دیا کہ وہ اپنا حکم ڈائریکٹر جنرل پولیس اور قانون نافذ کرنے والے اداروں کے اعلیٰ افسران کو دیتا اور شام کو ان سے رپورٹ طلب کرتا۔ ریاستی پولیس پر وہ اعتبار کرتا اور ان سے خفیہ اِن پُٹ لیتا۔ نہ کہ پیرا ملٹری فورس کو سارے اختیارات دے دیتا۔ جن کو نہ تو کشمیر کے سیاسی پس منظر کی جانکاری ہے اور نہ ہی عوام کی نفسیات کا پتہ ہے۔ اقبال نے کہا کہ اگر وہ ہوتا تو گورنر بنا رہتا۔ خود حوالدار نہیں بنتا۔ پولیس کے ایس، ایچ، او کو طلب نہیں کرتا بلکہ ڈی، جی کو بلاتا ۔ جواب سُن کر گورنر جگمو ہن خاموش ہو گئے تھے۔

میرا نام راجہ محمود احمد ہے۔ مجھے اور میرے دوست عجب سنگھ کو خالد حسین نے ہی اقبال کھانڈے کے ساتھ ملایا تھا اور کہا تھا کہ یہ دونوں خالد حسین کے بے لوث دوست ہیں۔ خوشی غمی میں ساتھ نبھانے والے۔ شروع شروع میں خالد حسین ہم دونوں کو لیکر کھانڈے صاحب کے گھر لے جاتا ۔ جہاں دارو کے ساتھ ساتھ لطیفوں کی محفل سے سب لطف اندوز ہوتے۔ ہمارے ایک اور دوست انجینئر شیخ تحسین مصطفی (ریٹائرڈ چیف انجینئر) بھی اقبال کھانڈے کے دوست تھے۔ بس اقبال سمیت ہم پانچ پیارے تقریباً روز شام یا چھُٹی والے دِن دوپہر کو اکٹھے بیٹھتے اور گپ شپ کرتے۔ مندرجہ بالا ساری باتیں اقبال کھانڈے نے خالد حسین اور ہم سب کو بتائی تھیں۔

اقبال کھانڈے دوبار وزیر اعلیٰ کا پرنسپل سیکرٹری بھی رہا۔ فاروق عبداللہ اور مفتی محمد سعید کے ساتھ۔ وہ کبھی کسی دباؤ میں نہیں آیا۔ اُسنے کبھی کوئی غلط کام نہیں کیا۔ یہاں تک کہ چیف منسٹر یا دیگر منسٹروں کو بھی غلط کام کرنے سے روکا۔ اسی وجہ سے اُسے ایک بار مرکز میں ڈیپوٹیشن پر بھیج دیا گیا اور دوسری بار اُسے جبری چھٹی پر بھیجا گیا۔ وہ خوشی خوشی چلا گیا لیکن اپنی ایمانداری پر سمجھوتہ نہیں کیا۔

ایک بار خالد حسین سرکاری کام کے سلسلہ میں دہلی گیا اور وہاں کشمیر ہاؤس چانکیہ پوری، اقبال کھانڈے کو ملنے کے لئے چلا گیا۔ فلیٹ میں صرف اُس کا نوکر جمال تھا۔ جمال نے بتایا کہ آج کل کڑکی کا دور چل رہا ہے۔ کشمیری گُلچے اور چائے پی جارہی ہے۔ کنٹین والوں نے کھانا دینا بند کر دیا ہے۔ چھ سات دِن سے صاحب نے دارو بھی نہیں پی ہے کیونکہ دارُو خریدنے کے لئے پیسے نہیں ہیں۔ صاحب دفتر بھی پیدل جاتا ہے۔ اُن کے پاس سرکاری کار بھی نہیں ہے۔ کار دینے سے چیف سیکرٹری صاحب نے منع کر دیا ہے۔ حالات بہت خراب ہیں۔'' خالد حسین اُسی وقت بازار گیا۔ اقبال کھانڈے کی من پسند شراب کا ایک کریٹ خریدا اور جمال کو دیا۔ کنٹین میں جا کر بل ادا کیا اور اُنھیں کہا کہ وہ دوبارہ کھانا دینا شروع کریں۔ جب اقبال کا ڈیپوٹیشن ختم ہوا اور وہ واپس جموں آیا تو اُسے محکمہ صحت کا کمشنر لگایا گیا۔ خالد حسین اُس کو ملنے اُس کے سرکاری کوارٹر پر گیا اور اُسے باہر گھومنے کے لئے کہا۔ وہ مان گیا اور کہنے لگا کہ ہری نواس ہوٹل میں بیٹھ کر دارو پیتے ہیں۔ جب وہ دنوں چلنے لگے تو اقبال نے میلا سا خان سوٹ پہنا تھا اور نائلن کی باتھ روم چپل پاؤں میں پہنی تھی۔ خالد حسین نے اُسے کپڑے تبدیل کرنے کے لئے کہا تو وہ بولا کہ اُس کے پاس کپڑے نہیں ہیں۔ سارے کپڑے جیکٹس اور کوٹ، بوٹ اور چپلیں وہ کشمیر ہاؤس کے ملازموں میں بانٹ آیا ہے۔ خالد حسین اُسے رگھو ناتھ بازار میں مونالیزا کے شوروم میں لے گیا جہاں اقبال نے دو پتلونیں اور دو ٹی شرٹیں پسند کیں۔ مونالیزا کے شوروم میں ہی اُس نے کپڑے تبدیل کئے اور پھر باٹا شُوز کی دکان سے اُس نے ایک بُوٹ پسند کیا۔ خالد حسین نے دونوں جگہ بل ادا کیا اور پھر ہری نواس چلے گئے۔ مہینے کی پہلی تاریخ کو اقبال نے خالد حسین کو ساری رقم واپس کر دی جو اُس نے دہلی اور جموں میں خرچ کی تھی۔

ایک بار کچھ فیکٹری مالکان کا جھگڑا ختم کرانے کے لئے خالد حسین ریٹز (Ritz) ہوٹل جموں میں ثالثی کا کردار ادا کر رہا تھا کیونکہ دونوں فیکٹری مالکان نے خالد حسین پر اعتماد ظاہر کرتے ہوئے اُسے ثالث قبول کیا تھا۔ معاملات طے ہونے کے بعد اُنہوں نے خالد حسین کو کھانے کے لئے روک لیا اور خود شراب پینے لگے۔ رات کے دس بج چکے تھے لیکن وہ پیئے جا رہے تھے۔ اتنے میں

خالد حسین کو اُس کو اہلیہ بھابی نسیم کا فون آیا اور پوچھا کہ وہ کہاں ہے تو خالد نے مذاق میں کہہ دیا کہ اُن کو اُگروادیوں نے اغوا کرلیا ہے اور رہائی کے لئے دو کروڑ روپے مانگ رہے ہیں۔ نسیم بھابی نے مجھے فون کیا۔ میں نے اقبال کھانڈے، تحسین مصطفی، عجب سنگھ اور تاج محی الدین کو فون پر اطلاع دی کہ خالد حسین اغوا ہو چکا ہے اور اغوا کار دو کروڑ روپئے مانگ رہے ہیں ورنہ اُسے قتل کردیں گے۔ خالد حسین کے مذاق نے پورا جموں ہلا دیا۔ تاج محی الدین جو منسٹر تھا، اُس نے پولیس کے سربراہ کو فون کردیا۔ اُدھر اقبال کھانڈے نے چیف سیکرٹری سے رابطہ کیا اور خالد حسین کی رہائی کے لئے ضروری قدم اٹھانے پر زور دیا۔ اقبال نے عجب سنگھ سے کہا کہ وہ فوراً دو کروڑ روپئے کا بندوبست کرے۔ اب رات کے 11 بجے رقم کا کیسے انتظام ہو۔ اتنے میں عجب سنگھ نے خالد حسین کو فون کیا تو اُس نے کہا کہ وہ ہوٹل ریٹرز میں کھانا کھا رہا ہے۔ عجب سنگھ نے پوچھا کہ تم کو کسی نے اغوا کیا ہے۔ جب خالد حسین نے کہا کہ بالکل نہیں، تو اُس نے خالد حسین کی بات اقبال کھانڈے سے کرائی لیکن اُسے یقین نہیں آیا۔ اُس نے میزبانوں سے بات کرانے کے لئے کہا۔ اُنہوں نے یقین دلایا کہ خالد حسین کو کسی نے اغوا نہیں کیا ہے لیکن اقبال کو پھر بھی یقین نہیں آیا۔ اُسنے کہا کہ وہ خالد حسین کو لیکر اُس کے گھر آئیں۔ رات کے بارہ بجے وہ اقبال کھانڈے کے گھر پہنچے جہاں ہم سب بیٹھے تھے۔ اقبال کھانڈے کو اطمینان ہوا اور جب اُسے خالد حسین نے بتایا کہ اس نے مذاق کیا تھا تو سبھی دوستوں نے خالد حسین کے ساتھ جو سلوک کیا وہ ناقابل بیان ہے۔ دوستوں کے لئے فکرمند ہونا اقبال کھانڈے کی بہت بڑی خوبی تھی۔ خالد حسین کی بیٹی ڈاکٹر ھما کی شادی کے دِنوں میں وہ اپنی بیگم اور شیشن جج کنیز فاطمہ بھابی کے ساتھ روز آتا اور دیر تک گانے گاتا۔ تنویر جہاں اور اُس کا خاوند شوکت بھائی، عجب سنگھ، تاج محی الدین خالد دُرانی اور میں سب مل کر شادی کے انتظامات میں مصروف رہتے اور رات کے کھانے کے بعد مقامی گلوکاروں کے گانے سنتے اور اقبال اُن کی سُر میں سُر ملاتا۔ تاج محی الدین نے تو اپنا پورا گھر شادی کے لئے مخصوص کردیا تھا۔ اس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ وہ دوستوں کے سکھ دُکھ میں ہمیشہ شامل ہوتا۔

زندگی نے اقبال کھانڈے کو شدید جھٹکے دیئے۔ اُن دِنوں وہ کمشنر صحت اور میڈیکل ایجوکیشن تھا، جب اُسے چھاتی میں لگاتار درد ہونے لگا۔ ڈاکٹروں نے اُسے دہلی جا کر ٹیسٹ کرانے کا مشورہ دیا۔ آل انڈیا میڈیکل انسٹی چیوٹ نے اُسے ممبئی ہسپتال منتقل ہونے کے لئے کہا جہاں کینسر اور پھیپھڑوں کے ماہر ڈاکٹر ڈیسائی نے اُس کے دوبارہ ٹسٹ لئے اور پایا کہ اُسے پھیپھڑوں کا کینسر ہے

اور اُس نے آپریشن کر کے دائیں پھیپھڑے کا آدھا حصہ کاٹ کر باہر نکال دیا۔ وہ لگ بھگ ڈیڑھ مہینے تک ممبئی ہسپتال کے ڈاکٹر ڈیسائی کے زیر علاج رہا اُس کی اہلیہ کنیز فاطمہ صاحبہ نے جی جان سے اُس کی تیمارداری کی۔ خالد حسین، تحسین مصطفی، عجب سنگھ اور میں دو بار جموں سے ممبئی اُس کی عیادت کے لئے گئے۔ ہسپتال سے اُسے چھٹی دے دی گئی اور کہا گیا کہ وہ دو چار مہینے کسی صحت افزا مقام پر گذارے۔ چھ مہینے کے بعد اقبال کھانڈے نے دوبارہ چھاتی میں شدید درد محسوس کیا اور وہ دوبارہ ڈاکٹر ڈیسائی کے پاس گیا۔ ٹیسٹ وغیرہ کرنے کے بعد ڈاکٹر ڈیسائی نے کہا کہ کینسر پسلیوں تک پھیل چُکا ہے۔ اُس نے اقبال کی دو پسلیاں بھی کاٹ دیں۔ جب درد میں کوئی افاقہ نہ ہوا تو اُس نے کہا کہ اقبال کے پاس صرف تین چار مہینے بچے ہیں۔ اس لئے اسے واپس لے جائیں۔ بھابی کنیز فاطمہ نے ڈاکٹر ڈیسائی سے گذارش کی کہ وہ اقبال کو امریکہ کے سب سے بڑے کینسر ہسپتال کے لئے ریفر کر دیں لیکن اُس کا کہنا تھا کہ وہاں جو کینسر کا معروف ڈاکٹر بھینس ہے، وہ اُس کا شاگرد ہے۔ اُسی نے ڈاکٹر بھینس کو پڑھایا ہے۔ وہ مجھ سے سیانا ڈاکٹر نہیں ہے لیکن اقبال کی اہلیہ نے اُسے مجبور کر دیا اور بالآخر ڈاکٹر ڈیسائی نے اُسے امریکہ کے کینسر ہسپتال کے لئے ریفر کر دیا۔ اقبال جموں آیا لیکن اُس کے پاس پاسپورٹ نہیں تھا۔ چیف سیکرٹری اشوک جیٹلی نے خالد حسین کو فون کر کے کہا کہ وہ پاسپورٹ دفتر جائے اور اقبال کا پاسپورٹ بنوائے۔ پاسپورٹ افسر نے کئی Formalities پوری کرنے کے لئے کہا۔ اُن کو پورا کرنے میں دو بج گئے۔ پھر اُس نے سی، آئی، ڈی کی رپورٹ مانگی۔ خالد حسین نے چیف سیکرٹری صاحب سے دوبارہ فون پر بات کی اور بتایا کہ پاسپورٹ افسر بار بار اڑچنیں ڈال رہا ہے۔ اتنے میں سی، آئی، ڈی کے انسپکٹر جنرل کی دستخط شدہ رپورٹ بھی بذریعہ فیکس آئی۔ جیٹلی صاحب نے دہلی میں وزارت خارجہ کے سیکرٹری سے بات کی اور اقبال کی حالت کے بارے میں بتایا۔ اُنہوں نے پاسپورٹ افسر کی کھینچائی کی تو شام کے پانچ بجے پاسپورٹ مل گیا۔ جب اقبال سے پوچھا گیا کہ وہ دیکھ بھال کے لئے اپنے ساتھ کس کو لے جانا چاہتا ہے تو اُس نے انل گوسوامی صاحب کا نام دیا جو اُس کا بیچ میٹ بھی تھا اور دوست بھی۔ ریاستی سرکار نے اقبال کی اہلیہ کو بطور خدمت گار اور انل گوسوامی صاحب کو معاون کے طور پر جانے کی اجازت دے دی۔ امریکہ پہنچنے پر ڈاکٹر بھینس نے اقبال کا اچھی طرح سے معائینہ کیا۔ جدید مشینوں سے اُس کے ٹیسٹ لئے گئے اور اُس نے بتایا کہ اقبال کو کینسر نہیں ہے۔ بلکہ زیادہ سگریٹ نوشی کرنے کی وجہ سے اُس کے ایک پھیپھڑے پر کالے داغ پڑ چکے تھے جسے ڈاکٹر ڈیسائی نے کینسر سمجھ لیا۔ اُس نے اقبال کے زخم کو پانی سے دھونے کے لئے کہا

اور ایک سفید رنگ کی چھوٹی سی ٹیبلٹ روزانہ کھانے کے لئے دی، جس شخص کو ڈاکٹر ڈیسائی نے کہا ہو کہ وہ صرف تین مہینے کا مہمان ہے۔ اُسے جب پتہ چلے کہ اُسے تو کینسر ہے ہی نہیں، اُس کی خوشی کا اندازہ آپ خود لگا سکتے ہیں۔ ڈاکٹر بھینس نے اُسے تنبہ کی کہ وہ سگریٹ نوشی بالکل بند کر دے ورنہ اُس کی زندگی جا سکتی ہے۔ دارُو کے لئے پوچھنے پر ڈاکٹر بھینس نے کہا کہ اول تو دارُو پینا چھوڑ دو۔ اگر یہ ممکن نہیں ہے تو ایک آدھ پیگ لے لیا کرو۔ اس سے زیادہ ہرگز نہیں۔ یوں ایک مہینہ گذار کر تینوں واپس جموں آ گئے۔ اقبال کا علاج سرکاری خرچے پر ہوا تھا لیکن انل گوسوامی صاحب نے سرکار سے کوئی پیسہ نہیں لیا بلکہ امریکہ جانے، آنے اور رہنے کا سارا خرچہ خود برداشت کیا۔ اقبال مکمل صحت یاب ہو کر اپنی ڈیوٹی پر حاضر ہو گیا اور مختلف محکمہ جات کی سربراہی کرنے لگا۔ مفتی محمد سعید صاحب نے اُسے اپنا پرنسپل سیکرٹری بنایا تو وزیر اعلیٰ کے دفتر کے کام میں تیزی آ گئی۔ کوئی بھی فائل اقبال کے میز پر رُکتی نہیں تھی لیکن جن کو اُلٹے پلٹے کام کروانے ہوتے تھے وہ بند ہو گئے اور اقبال کے خلاف سازشیں کرنے لگے اور مفتی صاحب کو مجبور کر دیا کہ وہ اقبال کو تبدیل کر دیں کیونکہ وہ کسی کی سنتا ہی نہیں ہے۔ مفتی سعید صاحب نے اُسے منصوبہ بندی محکمے کا پلاننگ کمشنر تعینات کر دیا۔ لیکن اُس کے خلاف سازشیں جاری رہیں جس کا انجام یہ ہوا کہ اقبال کو ایک ایسے جرم میں پھنسایا گیا جو اُس نے کیا ہی نہیں تھا اور یہ سب اُس وقت ہوا جب غلام نبی آزاد ریاست کے وزیر اعلیٰ تھے۔ ہوا یوں کہ ایک دِن ہم تحسین مصطفی کے دفتر میں بیٹھے تھے کہ وہاں اقبال کھانڈے کا دوست اور تحسین کا رشتے دار ڈاکٹر شاہد مغل آیا اور کہنے لگا کہ دہلی میں اُس کا ایک دوست سی، بی، آئی کے دفتر میں افسر ہے اور وہ بتا رہا تھا کہ 48 گھنٹے کے اندر اندر اقبال کھانڈے کو گرفتار کر لیا جائے گا۔ اُس پر الزام ہے کہ اُس نے ایک لڑکی کی عصمت دری کی ہے۔ اُس کے خلاف سی، بی، آئی نے کیس درج کر لیا ہے۔ خالد حسین اور تحسین نے اقبال سے فون پر بات کی اور بتایا کہ اُس کی گرفتاری کا وارنٹ جاری ہو چکا ہے۔ لہٰذا وہ اپنے بچاؤ کی کوئی تدبیر کرے۔ اقبال کھانڈے نے چیف سیکرٹری شری وجے بقایا سے دریافت کیا تو اُس نے کہا کہ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ پھر وہ اپنے قریبی رشتے دار اور جنرل ایڈمنسٹریشن محکمہ کے کمشنر خورشید گنائی سے ملا۔ اُسنے بھی لاعلمی کا اظہار کیا۔ جبکہ اُن کو پتہ تھا لیکن چیف منسٹر نے سختی سے منع کیا تھا کہ اقبال کو نہ بتایا جائے۔ گرفتاری سے پہلے اقبال کھانڈے سری نگر ڈسٹرکٹ ڈیولپمنٹ بورڈ کی میٹنگ میں بطور پلاننگ کمشنر حصہ لینے کے بعد اپنے سرکاری بنگلے کی طرف جا رہا تھا کہ سی، بی، آئی والوں نے اُسے گرفتار کر لیا اور الزام یہ لگایا گیا کہ دو سال پہلے اُس نے رقم دے کر ایک ویشیا سے ہمبستری کی ہے

۔اُس ویشیا نے سی، بی، آئی میں شکایت درج کرائی ہے۔ایسے ہی الزام دو وزیروں پر بھی لگائے گئے اور اُن کو بھی گرفتار کیا گیا تھا۔جس میں ایک رمن مٹو تھے اور دوسرے غلام احمد میر تھے جنہیں کانگریس جماعت کا ریاستی صدر بنانے کے چرچے عام تھے۔سی، بی، آئی کے سری نگر دفتر واقع ھمہاما میں اقبال کو لا یا گیا اور اُسے انٹیروگیٹ کیا گیا۔پھر اِن تینوں کو سری نگر کی سنٹرل جیل میں منتقل کر دیا گیا۔جہاں وہ پچاس دن رہے۔خالد حسین، عجب سنگھ اور میں کئی بار اُسے جیل میں جا کر ملتے رہے۔50 دن کے بعد اُن کی ضمانت پر رہائی ممکن ہوئی ۔ اور عدالت میں مقدمے کی کاروائی شروع ہوئی ۔ اقبال کھانڈے سینئر موسٹ آئی، اے، ایس افسر ہونے کی وجہ سے چیف سیکرٹری کے عہدے کا اُمیدوار تھا جبکہ غلام احمد میر کانگریس صدر بننے کا (آجکل وہ کانگریس کا ریاستی صدر ہے) اسی لئے سازشیوں نے ایک ویشیا اور اُس کی دلالن کو موٹی رقم دے کر میر صاحب اور اقبال کے خلاف بیان دلوایا گیا تھا۔ملزموں کی درخواست پر مقدمہ پنجاب اور ہریانہ ہائی کورٹ میں ٹرانسفر کیا گیا۔خالد حسین اقبال کو لیکر چندی گڈھ گیا۔ جہاں اُس کے کئی ادیب دوست رہتے تھے۔اُن سے مشورہ کر کے ایک نامی گرامی وکیل کیا گیا۔اکثر پیشیوں پر خالد حسین اور علی محمد وٹالی صاحب (ریٹائرڈ ڈی، آئی، جی) چندی گڈھ جاتے ۔ بالآخر پنجاب ہائی کورٹ نے مقدمہ خارج کر دیا۔جب یہ خبر جموں پہنچی تو خالد حسین اور میں رات کے 9 بجے جموں سے چندی گڈھ کے لئے روانہ ہوئے اور صبح دم کشمیر گیسٹ ہاؤس پہنچ گئے جہاں رمن مٹو، غلام احمد میر اور قبال کھانڈے ٹھہرے تھے ۔مبارکبادیاں اور خوشیاں بانٹی گئیں اور پھر واپس جموں چلے آئے ۔ کچھ ہی دِنوں کے بعد چیف سیکرٹری مادھو لال کو مرکز میں بھیج کر وزیراعلیٰ عمر عبداللہ نے محمد اقبال کھانڈے کو جموں وکشمیر کا چیف سیکرٹری مقرر کر دیا۔خالد حسین اُس روز پنجابی یونیورسٹی کے ایک سیمینار میں شرکت کی غرض سے پٹیالے میں تھا۔خبر ملتے ہی وہ سیمینار کو چھوڑ کر جموں کے لئے روانہ ہوا اور چار بجے جموں کے سیکریٹریٹ میں جا کر اقبال کو مبارک دی اور دونوں گلے مل کر پُرسکون ہوئے۔

2011ء میں اقبال کی زندگی میں ایک اور بڑا زلزلہ آیا۔اُس کا لختِ جگر شادی میں شرکت کرنے کے بعد واپس سری نگر آ رہا تھا کہ اُس کی کار ایک درخت سے جا ٹکرائی اور وہ موقع پر ہی دم توڑ گیا۔اِس ناگہانی المیے اور صدمے سے اقبال پوری طرح سے ٹوٹ گیا۔جوان بیٹا مر جائے تو ماں باپ کا دِل مر جاتا ہے۔ جوان بیٹے کی وفات کے غم میں وہ دوبارہ شراب نوشی کرنے لگا اور سگریٹ پینے لگا۔غم غلط کرنے کے لئے وہ اپنے آپ کو دھوئیں میں اُڑانے لگا۔اُسے پبلک سروس کمیشن کے

چیئرمین کا عہدہ دینے کی پیش کش کی گئی۔مشیر بنانے کے لئے کہا گیا لیکن وہ نہ مانا اور ریٹائر ہوتے ہی گھر آ گیا۔شراب اور سگریٹ نوشی کی وجہ سے بیس سال کے بعد اُسے دوبارہ کینسر نے آن دبو چا ۔اُسے ہسپتال داخل کیا گیا۔ پھر کبھی گھر اور کبھی ہسپتال آنا جانا لگا رہا۔کینسر اُس کے اندر پھیلنے لگا وہ خالد حسین سے کہتا کہ وہ مرنے کے لئے تیار ہے ۔ پھر اللہ اُس کی جان قبض کیوں نہیں کرتا ۔ کیوں اُسے تکلیف دے رہا ہے۔شاید اللہ نے اُس کی سن لی ، اور بالآخر اُس کی روح جسم سے پرواز کر گئی اور اُسے گھر کے سامنے قبرستان میں ساجد کی قبر کے ساتھ دفن کر دیا گیا۔اللہ مغفرت کرے ۔ اقبال ایک درویش صفت انسان تھا۔صوفی منش بندہ تھا۔ ہمارے لئے وہ ہمیشہ زندہ رہے گا۔

لکھ لکھ بدیّاں ، سوسو طعنے، سبھے سِر تے سہیے
توڑے سِر و نجے دھڑ نالوں، تاں بھی حال نہ کہیئے
سخن جِنہاں دا ہووے دارُو، حال اُنھا ئیں کہیئے
نال سجن دے رہیئے (شاہ حسین)

لاکھ بُرایاں، سو سو طعنے، سب سر پر سہنا
تمہارے دھڑ سے سر الگ کر دیں تو بھی حال نہ کہنا
سخن وری علاج ہو جن کا، حال اُنہی سے کہنا
ساتھ سجن کے ساتھ رہنا (ترجمہ)

☆☆☆

Digital Claas rooms mein samaji-Jazbati iktesaab by Prof. Noushad Husain
(Principal MANUU CTE Bhopal) cell-706359414, 8159973500
پروفیسر نوشاد حسین (پرنسپل، مانوسی۔ٹی۔ای۔بھوپال)

ڈیجیٹل کلاس رومز میں سماجی۔جزباتی اکتساب

تعارف:

حالیہ برسوں میں سماجی۔جزباتی اکتساب کو تعلیم کا ایک اہم جز سمجھا جانے لگا ہے۔ سماجی۔جزباتی اکتساب طلباء کی جذباتی ذہانت، تعلقات کی مہارتوں اور عمومی فلاح و بہبود کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔سماجی۔جزباتی اکتساب میں ایسی مہارتوں کی وسیع رینج شامل ہے جو افراد کو اپنے جذبات کو سمجھنے اور ان کا انتظام کرنے، ہمدردی پیدا کرنے، مثبت تعلقات قائم کرنے اور ذمہ دارانہ فیصلے کرنے کے قابل بناتی ہیں۔ جیسے جیسے تعلیمی ادارے اپنی تدریسی عملیاتیوں میں ٹیکنالوجی کو شامل کرتے جارہے ہیں، خاص طور پر COVID-19 کی وبا کی وجہ سے ڈیجیٹل کلاس رومز میں سماجی۔جزباتی اکتساب کے نفاذ کی ضرورت بڑھ گئی ہے۔ڈیجیٹل تعلیم کی طرف منتقلی نے اساتذہ اور طلباء کے لئے منفرد چیلنجز پیدا کیے ہیں۔ بالمشافہ تعامل کی کمی مضبوط تعلقات کی ترقی میں رکاوٹ ڈال سکتی ہے جس سے طلباء میں تنہائی اور بے زاری کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔مزید برآں آن لائن تعلیم کی تیز رفتاری نے مؤثر سماجی۔جزباتی اکتسابی حکمت عملیوں کی ضرورت کو بڑھا دیا ہے جو ورچوئل سیکھنے کے ماحول میں ضم کی جاسکیں۔ یہ مقالہ ڈیجیٹل کلاس رومز میں سماجی۔جزباتی اکتساب کی اہمیت کو دریافت کرتا ہے، طلباء کی مشغولیت، تعلیمی کارکردگی اور جذباتی فلاح و بہبود پر اس کے اثرات کا تجزیہ کرتا ہے۔ہم آن لائن سیکھنے کے سیٹ اپ میں سماجی۔جزباتی اکتساب کے نفاذ کی مؤثر حکمت عملیوں کا تجزیہ کریں گے، ممکنہ چیلنجز پر گفتگو کریں گے اور طلباء کی سماجی اور جذباتی ترقی کو بڑھانے کے لئے بہترین طریقوں کی تجاویز پیش کریں گے۔

"ڈیجیٹل کلاس روم میں سماجی۔جذباتی تعلیم" سے مراد آن لائن یا ٹیکنالوجی کے ذریعے بڑھائے گئے تعلیمی ماحول میں سماجی اور جذباتی مہارتوں کی ترقی کو شامل کرنا ہے۔سماجی۔جذباتی تعلیم (SEL) کا مقصد خود آگاہی، خود نظم و نسق، سماجی آگاہی، تعلقات بنانے کی مہارت اور ذمہ دارانہ فیصلے کرنے کی

صلاحیت کو فروغ دینا ہے۔ جب اسے ڈیجیٹل کلاس روم میں لاگو کیا جاتا ہے تو SEL میں ڈیجیٹل آلات، سرگرمیاں، اور پلیٹ فارمز شامل ہوتے ہیں جو طلباء کو اپنی جذبات کو سمجھنے اور ان کا نظم ونسق کرنے، مثبت تعلقات بنانے اور سوچ سمجھ کر فیصلے کرنے میں مدد فراہم کرتے ہیں — یہ سب آن لائن یا ہائبرڈ لرننگ کے تناظر میں ہوتا ہے۔

سماجی۔جزباتی اکتساب کی اہمیت: تحقیقات کی بڑھتی ہوئی وسعت نے طلباء کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر سماجی۔جزباتی اکتساب کے مثبت اثرات کو اجاگر کیا ہے۔ سماجی۔جزباتی اکتساب محض نصاب کے لئے ایک اضافی چیز نہیں ہے۔ یہ ایک مؤثر سیکھنے کے ماحول کو تخلیق کرنے میں ایک لازمی جز ہے جو بچے کی نشوونما کرتا ہے۔ تعلیمی، سماجی اور جذباتی تعلیم کے لیے تعاون کرنے والے ادارے (CASEL) کے مطابق سماجی۔جزباتی اکتساب پروگراموں سے تعلیمی کارکردگی، سلوک کی تبدیلیوں اور جذباتی نظم وضبط میں اہم بہتری آسکتی ہے۔ مطالعات سے ظاہر ہوتا ہے کہ جو طلباء سماجی۔جزباتی اکتسابی پروگراموں میں حصہ لیتے ہیں وہ بہتر تعلیمی نتائج، زیادہ حاضری کی شرح اور بہتر سماجی مہارتیں ظاہر کرتے ہیں۔ ڈیجیٹل کلاس رومز کے تناظر میں سماجی۔جزباتی اکتساب آن لائن سیکھنے کی طرف سے پیش کردہ چیلنجز کا سامنا کرنے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ جسمانی موجودگی کی کمی طلباء میں تنہائی اور اضطراب کے جذبات کو بڑھا سکتی ہے۔ اس لیے یہ ضروری ہے کہ اساتذہ اپنے طلباء کی جذباتی صحت کی حمایت کے لیے جان بوجھ کر سماجی۔جزباتی اکتساب طریقوں کو شامل کریں۔ اس کے علاوہ، ڈیجیٹل کلاس رومز جدید سماجی۔جزباتی اکتسابی طریقوں کے مواقع فراہم کر سکتے ہیں جو سیکھنے کے تجربات کو بڑھانے کے لیے ٹیکنالوجی کا فائدہ اٹھاتے ہیں۔

ڈیجیٹل کلاس رومز میں سماجی۔جزباتی اکتساب: ڈیجیٹل کلاس روم میں سماجی۔جذباتیا کتساب سے مراد آن لائن یا ٹیکنالوجی سے تقویت یافتہ تعلیمی ماحول میں سماجی اور جذباتی مہارتوں کی ترقی کو شامل کرنا ہے۔ سماجی۔جذباتی اکتساب کا مقصد خود آگاہی، خود نظم وضبط، سماجی آگاہی، تعلقات کی مہارتیں اور ذمہ دارانہ فیصلہ سازی کو فروغ دینا ہے۔ جب اسے ڈیجیٹل کلاس روم میں لاگو کیا جاتا ہے تو سماجی۔جذباتیا کتساب میں ڈیجیٹل آلات، سرگرمیاں اور پلیٹ فارمز کا استعمال شامل ہوتا ہے تاکہ طلباء کو اپنی جذباتی سمجھ اور نظم وضبط میں مدد فراہم کی جاسکے، مثبت تعلقات استوار کیے جاسکیں اور سوچ سمجھ کر فیصلے کیے جاسکیں یہ سب آن لائن یا ہائبرڈ لرننگ کے تناظر میں ہوتا ہے۔ ڈیجیٹل کلاس روم میں سماجی۔جذباتیا کتساب میں انٹرایکٹو سرگرمیاں، ورچوئل گروپ ورک، ذہنی سکون کی

مشقیں، ڈیجیٹل جرنلنگ اور آن لائن مباحثے شامل ہو سکتے ہیں جو ہمدردی اور بات چیت کی مہارتوں کو فروغ دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر اساتذہ ویڈیو کانفرنسنگ کا استعمال کرتے ہوئے ایک "سرکل ٹائم" بنا سکتے ہیں جہاں طلباء جذبات کا اظہار کریں، یا وہ سماجی-جذباتیا کتساب کے تصورات کو دلچسپ انداز میں تقویت دینے کے لیے ایپس اور گیمز استعمال کر سکتے ہیں۔

ادبیات سے متعلقہ جائزہ: سماجی-جزباتی اکتساب کے بارے میں ادبی جائزے کی حمایت کرنے کے لیے یہاں کلیدی حوالہ جات ہیں جو اس بات پر توجہ مرکوز کرتے ہیں کہ سماجی-جزباتی اکتساب پروگرام طلباء کی جذباتی اور تعلیمی ترقی پر خاص طور پر ورچوئل لرننگ کے سیاق وسباق میں کس طرح اثر انداز ہوتے ہیں۔

ا۔ ڈرلک، جے. اے، ویزبرگ، آر. پی، ڈائمنسکی، اے. بی، ٹیلر، آر. ڈی، اور شیلنجر، کے. بی. (2011) نے ایک میٹا-تجزیے میں دکھایا کہ سماجی-جزباتی اکتساب پروگرام طلباء کی جذباتی مہارتوں، رویوں اور تعلیمی کارکردگی کو نمایاں طور پر بہتر کرتے ہیں۔ یہ تجزیہ جس میں مختلف اسکول کی بنیاد پر مداخلتیں شامل ہیں منظم سماجی-جزباتی اکتسابی پروگراموں کی اہمیت کو اجاگر کرتا ہے جنہیں ڈیجیٹل ماحول میں ڈھال کر اسی طرح کے نتائج حاصل کیے جا سکتے ہیں۔

۲۔ اکیڈمک، سوشل اور ایموشنل لرننگ کے لیے تعاون (CASEL) ایک فریم ورک فراہم کرتا ہے جو خود آگاہی، خود انتظام، سماجی آگاہی، تعلقات کی مہارت اور ذمہ دار فیصلے کرنے کی ترقی پر زور دیتا ہے۔ CASEL کی تحقیق یہ ظاہر کرتی ہے کہ سماجی-جزباتی اکتسابی پروگرام مثبت اسکول کے ماحول کو فروغ دیتے ہیں اور انہیں ڈیجیٹل کلاس رومز میں اپنایا جا سکتا ہے۔ یہ طلباء کے سیکھنے کے جذباتی تعلق کو برقرار رکھنے میں مدد کرتے ہیں۔

۳۔ ویسٹھووین، ایس. ایم. (2022) سماجی-جزباتی اکتساب پر ایک جامع ادبی جائزہ پیش کرتے ہیں۔ یہ طلباء کی جذباتی بہبود اور تعلیمی کامیابی پر اس کے اثرات کا تجزیہ کرتے ہیں۔ اس بات پر غور کرتے ہوئے کہ ورچوئل پلیٹ فارم کس طرح سماجی-جزباتی اکتساب کی مہارتوں جیسے ہمدردی اور لچک کو سپورٹ کر سکتے ہیں ویسٹھووین کی تحقیق ڈیجیٹل سیٹنگز میں سماجی-جزباتی اکتساب کی قابلیت پر توجہ مرکوز کرتی ہے۔

۴۔ امریکن سائیکولوجیکل ایسوسی ایشن (APA) ڈیجیٹل کلاس رومز میں طلباء کے لیے سماجی-جزباتی اکتساب کے فوائد پر روشنی ڈالتی ہے۔ یہ تحقیق اس بات پر زور دیتی ہے کہ سماجی-جزباتی اکتساب تنہائی

کو کم کرنے اور دور دراز کے سیٹنگز میں شمولیت کو بڑھانے میں کس طرح مدد کر سکتی ہے۔APA کی تحقیق یہ ظاہر کرتی ہے کہ سماجی۔جزباتی اکتساب ورچوئل سیکھنے کے ماحول میں حوصلہ افزائی کو برقرار رکھنے، مثبت تعلقات کو فروغ دینے اور دباؤ کو منظم کرنے میں کس طرح اہم ہے۔

۵۔یوڈر، این .(2014) کلاس روم کی ترتیبات میں سماجی۔جزباتی اکتساب کی حمایت کرنے والی تدریسی طریقوں پر بات کرتی ہیں جنہیں ڈیجیٹل پلیٹ فارمز کے لیے ڈھالا جا سکتا ہے تاکہ " مکمل بچے" کی تعلیم دی جا سکے۔ یوڈر کی تحقیق یہ بصیرت فراہم کرتی ہے کہ سماجی۔جزباتی اکتساب کی مہارتیں طلباء کی ترقی کے لیے کتنی اہم ہیں اور انہیں آن لائن ماڈیولز اور انٹرایکٹو سیکھنے کے ذریعے کیسے پروان چڑھایا جا سکتا ہے۔

یہ حوالہ جات سماجی۔جزباتی اکتساب کے کردار کو سمجھنے کے لیے ایک مضبوط بنیاد فراہم کرتے ہیں۔

ڈیجیٹل کلاس روم میں سماجی۔جذباتی اکتساب کے فوائد: ڈیجیٹل کلاس روم میں سماجی۔جذباتی اکتساب میں کئی فائدے ہیں جو منفرد طریقوں سے طلباء کی سماجی اور جذباتی نشوونما کو بہتر بناتے ہیں۔ کچھ اہم فوائد مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔رسائی اور شمولیت: ڈیجیٹل پلیٹ فارمز وسیع پیمانے پر رسائی فراہم کرتے ہیں جس میں وہ طلباء بھی شامل ہیں جو حضوری کلاسز میں شرکت نہیں کر سکتے۔آن لائن سماجی۔جزباتی اکتسابی سرگرمیاں متنوع پس منظر، صلاحیتوں اور جغرافیائی مقامات کے طلباء کو شرکت کا موقع دیتی ہیں جس سے سماجی۔جزباتی اکتساب مزید جامع بن جاتا ہے۔

۲۔ لچکدار اکتسابی ماحول: ڈیجیٹل سیٹنگ طلباء کو اپنے آرام دہ انداز میں اور اپنی رفتار سے سماجی۔جزباتی اکتسابی سرگرمیوں میں شامل ہونے کا موقع فراہم کرتی ہے۔وہ مواد کو دوبارہ دیکھ سکتے ہیں، ریکارڈ شدہ سیشنز کو دیکھ سکتے ہیں یا خود سے مہارتیں حاصل کر سکتے ہیں جس سے خود پر قابو اور خود آگاہی کو فروغ ملتا ہے۔

۳۔ڈیجیٹل ٹولز کی تنوع: ٹیکنالوجی مختلف ٹولز جیسے ایپس، گیمز اور انٹرایکٹو پلیٹ فارمز کی وسیع اقسام پیش کرتی ہے جو سماجی۔جزباتی اکتسابی سرگرمیوں کو دلچسپ اور متحرک بنا سکتے ہیں۔یہ ڈیجیٹل ٹولز فوری تاثرات اور انفرادی سیکھنے کا تجربہ فراہم کرتے ہیں جو ہر طالب علم کی ضروریات کو پورا کرتا ہے۔

۴۔گمنامی اور محفوظ اظہار: کچھ طلباء آن لائن سیٹنگ میں اپنی سوچ اور جذبات کو شیئر کرنے میں زیادہ آرام دہ محسوس کرتے ہیں جہاں وہ کبھی کبھی گمنام رہ سکتے ہیں۔ یہ کھلے دل سے خود اظہار کی حوصلہ

افزائی کرتا ہے۔ خاص طور پر ان طلباء کے لیے جو حضوری سیٹنگز میں جھجک محسوس کرتے ہیں۔

۵۔ بہتر خود احتسابی: ڈیجیٹل جرنلنگ اور خود تشخیصی ٹولز طلباء کو اپنے خیالات، جذبات اور وقت کے ساتھ اپنی ترقی کو نجی طور پر ٹریک کرنے کا موقع دیتے ہیں۔ یہ گہری خود احتسابی کو فروغ دیتا ہے جو سماجی۔جزباتی اکتساب کا ایک اہم حصہ ہے۔

۶۔ ڈیجیٹل مواصلاتی مہارتوں کی ترقی: جذبات کا اظہار کرنے اور تعلقات کو آن لائن سنبھالنے کی مہارت سیکھنا طلباء کو ڈیجیٹل مواصلات کی مہارتیں سکھاتا ہے۔ بشمول آن لائن باعزت رویہ، ہمدردی اور تنازعات کا حل۔ یہ مہارتیں آج کے ڈیجیٹل دور میں انتہائی اہم ہیں۔

۷۔ دوسرے اکتسابی وسائل کے ساتھ آسان انضمام: ڈیجیٹل سماجی۔جزباتی اکتساب کو دیگر آن لائن تعلیمی وسائل کے ساتھ باآسانی جوڑا جا سکتا ہے جس سے طلباء مختلف مضامین میں سماجی۔جزباتی اکتسابی مہارتیں سیکھ سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر گروپ پروجیکٹس، فورمز اور مباحثے علمی سیکھنے کے ساتھ ساتھ تعاون اور سماجی آگاہی کو فروغ دے سکتے ہیں۔

۸۔ توسیع پذیری اور مستقل مزاجی: ڈیجیٹل سماجی۔جزباتی اکتسابی پروگراموں کو بڑے پیمانے پر طلباء تک مستقل انداز میں پہنچایا جا سکتا ہے۔ معیاری ڈیجیٹل مواد یقینی بناتا ہے کہ مختلف اسکولوں یا علاقوں کے طلباء کو اعلیٰ معیار کا منظم سماجی۔جزباتی اکتساب مواد فراہم ہو۔

۹۔ ڈیٹا سے حاصل کردہ بصیرت: ڈیجیٹل ٹولز طلباء کی شمولیت اور پیشرفت کو ٹریک کر سکتے ہیں جو اساتذہ کو طلباء کے سماجی۔جزباتی اکتساب کی ترقی کو بہتر طور پر سمجھنے میں مدد دے سکتے ہیں۔ جہاں اضافی مدد کی ضرورت ہو سکتی ہے وہاں یہ ڈیٹا مداخلت کو حسب ضرورت بنانے اور ان شعبوں کی نشاندہی میں مدد کر سکتا ہے۔

۱۰۔ گیمیفیکیشن کے مواقع: گیمیفائڈ سماجی۔جزباتی اکتسابی سرگرمیاں سماجی اور جذباتی مہارتیں سیکھنے کو مزید تفریحی اور دلچسپ بنا سکتی ہیں۔ مثال کے طور پر ایسی گیمز جو ہمدردی، ٹیم ورک یا عزم کو انعام دیتی ہیں طلباء کی سماجی۔جزباتی اکتسابی تصورات میں دلچسپی اور سمجھ میں اضافہ کر سکتی ہیں۔

مختصراً ڈیجیٹل کلاس روم میں سماجی۔جزباتی اکتساب کو شامل کرنے سے نہ صرف جدید ضروریات کے مطابق سماجی۔جذباتی اکتساب کو فروغ دیا جا سکتا ہے بلکہ یہ لچکدار، ڈیٹا سے چلنے والے اور انٹرایکٹو سیکھنے کے مواقع فراہم کرتا ہے جو آج کے ٹیکنالوجی میں ماہر طلباء کو پسند آ سکتے ہیں۔

ڈیجیٹل کلاس رومز میں سماجی۔جزباتی اکتساب کو نافذ کرنے کے مؤثر طریقے:

☆ایک محفوظ اور مددگار سیکھنے کا ماحول بنانا۔

ایک محفوظ اور مددگار آن لائن کلاس روم قائم کرنا مؤثر سماجی۔جزباتی اکتساب کے لیے بنیاد ہے۔ اساتذہ مثبت ڈیجیٹل ماحول کو فروغ دینے کے لیے درج ذیل طریقوں سے کام کر سکتے ہیں:

ا۔کھلی مواصلات کی حوصلہ افزائی: باقاعدہ چیک ان اور جذبات کے بارے میں کھلی بحثیں طلباء کو اپنے خیالات کا اظہار کرنے میں مدد کر سکتی ہیں۔اساتذہ ان بات چیت کو سہولت فراہم کرنے کے لیے ورچوئل فورمز یا بریک آؤٹ رومز جیسے ٹولز کا استعمال کر سکتے ہیں۔

۲۔واضح توقعات کا تعین: ڈیجیٹل جگہوں میں احترام کے رویے اور تعاملات کے لیے اصولوں کا قیام حفاظت اور تعلق کی ایک حس پیدا کرنے میں مدد کرتا ہے۔اساتذہ کو توقعات کو واضح طور پر بیان کرنا چاہیے اور طلباء میں وہی رویے ماڈل بنانا چاہیے جو وہ دیکھنا چاہتے ہیں۔

☆نصاب میں سماجی۔جزباتی اکتساب کو ضم کرنا۔

نصاب میں سماجی۔جزباتی اکتساب کو ضم کرنا طلباء کی جذباتی مہارتوں کو بڑھا سکتا ہے جبکہ تعلیمی کامیابی کو بھی فروغ دے سکتا ہے۔حکمت عملیوں میں شامل ہیں:

۳۔پروجیکٹ پر مبنی سیکھنا: ایسے مشترکہ پروجیکٹ جو ٹیم ورک اور مسئلے کو حل کرنے کی ضرورت رکھتے ہیں تعلقات کی مہارتوں کو فروغ دے سکتے ہیں اور جذباتی آگاہی کو بڑھا سکتے ہیں۔مثال کے طور پر طلباء ایک کمیونٹی سروس پروجیکٹ پر مل کر کام کر سکتے ہیں جو انہیں سماجی مسائل کا جائزہ لینے اور ہمدردی پیدا کرنے کی ترغیب دیتا ہے۔

۴۔عکاسی کے طریقے: عکاسی کی تحریری اسائنمنٹس یا جرنلز کو شامل کرنے سے طلباء کو اپنے جذبات اور تجربات کو پروسیس کرنے کی اجازت ملتی ہے۔یہ طریقہ انہیں اپنی جذباتی ترقی کو علمی اکتساب کے ساتھ جوڑنے میں مدد کر سکتا ہے جس سے ان کی مجموعی ترقی میں سماجی۔جزباتی اکتساب کی اہمیت کو مضبوط کیا جا سکتا ہے۔

☆سماجی۔جزباتی اکتساب کی حمایت کے لئے ٹیکنالوجی کا استعمال

ڈیجیٹل ٹولز کے استعمال سے سماجی۔جزباتی اکتساب کے تجربات کو بہتر بنایا جا سکتا ہے جو کہ انٹرایکٹو اور دلچسپ وسائل فراہم کرتا ہے۔کچھ مؤثر ٹولز مندرجہ ذیل ہیں:

۵۔ذہن سازی اور فلاح و بہبود کی ایپس: ایسے ایپس کو شامل کرنا جو ذہن سازی اور جذباتی نظم وضبط کو فروغ دیتے ہیں، جیسے Calm یا Headspace، طلباء کو تناؤ کا انتظام کرنے اور اپنی جذباتی

فلاح و بہبود کو بہتر بنانے میں مدد کرسکتا ہے۔ اساتذہ اپنی روزمرہ کی روٹین میں مختصر ذہن سازی کی سرگرمیاں شامل کرسکتے ہیں۔

۶۔ اجتماعی پلیٹ فارم: Padlet یا Flipgrid جیسے پلیٹ فارم کا استعمال طلباء کو اپنے خیالات اور احساسات کو گمنامی یا محفوظ جگہ میں شیئر کرنے کی اجازت دیتا ہے جو جذبات پر کھلی گفتگو کو فروغ دیتا ہے۔ ان پلیٹ فارمز کا استعمال آئس بریکرز یا سماجی۔ جزباتی موضوعات پر گروپ بحثوں کے لئے کیا جاسکتا ہے۔

☆ ماہرین تعلیم کے لئے پیشہ ورانہ ترقی

سماجی۔ جزباتی اکتساب کی حکمت عملیوں میں مسلسل پیشہ ورانہ ترقی اساتذہ کے لئے بہت ضروری ہے تاکہ وہ ڈیجیٹل کلاس رومز میں مؤثر طریقے سے حکمت عملیوں کو نافذ کرسکیں۔ اسکولوں کو فراہم کرنا چاہیے:

۷۔ ورکشاپس اور تربیت: آن لائن ماحول کے لیے سماجی۔ جزباتی اکتساب حکمت عملیوں پر مرکوز تربیتی سیشنز کی پیشکش اساتذہ کو طلباء کی مؤثر حمایت کے لئے ضروری معلومات اور مہارت فراہم کر سکتی ہے۔

۸۔ تعاون اور اشتراک کے نیٹ ورکس: ماہرین تعلیم کے لیے تعاون اور بہترین طریقوں کا اشتراک کرنے کے مواقع پیدا کرنا سپورٹ کی کمیونٹی کو فروغ دے سکتا ہے اور سماجی۔ جزباتی اکتسابی اقدامات کی مجموعی تاثیر کو بڑھا سکتا ہے۔

اساتذہ کے لئے تعاون کرنے اور بہترین طریقوں کا اشتراک کرنے کے مواقع پیدا کرنے سے ایک حمایت کا کمیونٹی پیدا ہوسکتا ہے اور SEL کے اقدامات کی مجموعی مؤثریت بڑھ سکتی ہے۔

ڈیجیٹل کلاس رومز میں سماجی۔ جزباتی اکتساب کو عمل میں لانے میں چیلنجز

ڈیجیٹل کلاس رومز میں سماجی۔ جزباتی اکتساب کو ضم کرنے سے وابستہ بے شمار فوائد کے باوجود کچھ چیلنجز باقی رہتے ہیں:

۱۔ ٹیکنالوجی تک محدود رسائی: ٹیکنالوجی تک رسائی میں محدودگی طلباء کے سماجی۔ جزباتی اکتسابی تجربات میں عدم مساوات پیدا کرسکتی ہے۔ ایسے طلباء جو قابل اعتماد انٹرنیٹ رسائی یا ڈیجیٹل آلات سے محروم ہیں وہ آن لائن سیکھنے میں مکمل طور پر شرکت کرنے میں دشواری محسوس کرسکتے ہیں جو ان کی سماجی اور جذباتی ترقی کو متاثر کرسکتا ہے۔

۲۔ بالمشافہ تعامل کی کمی: جسمانی تعاملات کی عدم موجودگی طلباء کے درمیان اور طلباء اور اساتذہ کے درمیان مضبوط تعلقات کی ترقی میں رکاوٹ بن سکتی ہے۔ اساتذہ کو باقاعدہ ورچوئل ملاقاتوں یا سماجی تقریبات کے ذریعے تخلیقی طریقے تلاش کرنا ضروری ہے۔

۳۔ تبدیلی کی مخالفت: بعض اوقات اساتذہ سماجی۔جزباتی اکتسابی طریقوں کو اپنانے میں مزاحمت کر سکتے ہیں۔ خاص طور پر اگر وہ موجودہ نصاب کی ضروریات سے پریشان ہوں یا سماجی۔جزباتی اکتسابی تصورات سے ناواقف ہوں۔ اس مزاحمت کا مقابلہ کرنے کے لیے سماجی۔جزباتی اکتساب کی اہمیت اور اساتذہ کی مسلسل حمایت کے بارے میں واضح مواصلت ضروری ہے۔

۴۔ تشخیص کے چیلنجز: ڈیجیٹل کلاس رومز میں سماجی۔جزباتی اکتساب کے اقدامات کی مؤثریت کی پیمائش کرنا پیچیدہ ہوسکتا ہے۔ روایتی تشخیصی طریقے طلباء کی جذباتی ترقی یا سماجی۔جزباتی اکتساب کے اثرات کو تعلیمی کارکردگی پر پوری طرح سے نہیں پکڑ سکتے ہیں۔ سماجی۔جزباتی اکتساب کے نتائج کی جانچ کے لیے مناسب تشخیصی ٹولز تیار کرنا ضروری ہے۔

کیس اسٹڈیز اور مثالیں:

ا۔ مثال 1: ایک ورچوئل مڈل اسکول میں سماجی۔جزباتی اکتساب

ایک ورچوئل مڈل اسکول میں اساتذہ نے نصاب میں ہفتہ وار سماجی۔جزباتی چیک ان شامل کرتے ہوئے ایک جامع سماجی۔جزباتی اکتسابی پروگرام کو نافذ کیا۔ اساتذہ نے طلباء کو اپنے جذبات کا اشتراک کرنے اور ایک دوسرے کی حمایت کرنے کے لیے چھوٹے گروپ مباحثوں کی سہولت کے لیے بریک آؤٹ رومز کا استعمال کیا۔ نتیجتاً، طلباء نے محسوس کیا کہ وہ اپنے ساتھیوں سے زیادہ جڑے ہوئے ہیں جس کی وجہ سے مشغولیت میں اضافہ ہوا اور تعلیمی کارکردگی میں بہتری آئی۔

۲۔ مثال 2: ہائی اسکول میں مشترکہ پروجیکٹس:

ایک ہائی اسکول کے سیٹ اپ میں اساتذہ نے کمیونٹی سروس پر مرکوز پروجیکٹ پر مبنی سیکھنے کا آغاز کیا۔ طلباء نے چھوٹے گروپوں میں کام کیا تاکہ اپنے علاقے میں اثر انداز ہونے والے سماجی مسائل کی شناخت کر سکیں اور ان کے حل تیار کر سکیں۔ اس پروجیکٹ نے تعلقات کی مہارتوں کو فروغ دیا اور طلباء کو حقیقی دنیا کے تناظر میں اپنی جذباتی مہارتوں کو لاگو کرنے کی اجازت دی۔ طلباء کی جانب سے موصول ہونے والے تاثرات نے ہمدردی کا بڑھتا ہوا احساس اور سماجی مسائل کے بارے میں بڑھتی ہوئی آگاہی کا اشارہ دیا۔

ڈیجیٹل کلاس روم میں سماجی۔جذباتی اکتساب کی حدود۔

ڈیجیٹل کلاس روم میں سماجی۔جذباتی اکتساب کا نفاذ مؤثر ثابت ہوسکتا ہے لیکن اس میں کچھ حدود بھی ہیں:

۱۔جسمانی تعامل کی کمی: سماجی۔جزباتی اکتساب اکثر ہمدردی پیدا کرنے، تنازعات کو سنبھالنے اور سماجی اشاروں کو فروغ دینے کے لیے آمنے سامنے تعاملات پر انحصار کرتا ہے۔ڈیجیٹل کلاس روم میں محدود جسمانی موجودگی کے سبب طلباء کے لیے جسمانی زبان، چہرے کے تاثرات اور آواز کے لہجے کو سمجھنا مشکل ہوسکتا ہے جو جذباتی سمجھ بوجھ کے لیے اہم ہیں۔

۲۔ٹیکنالوجی کی رکاوٹیں: قابل اعتماد آلات، مستحکم انٹرنیٹ اور مناسب ڈیجیٹل ٹولز تک رسائی کچھ طلباء کے لیے چیلنج ہوسکتی ہے جس کے باعث سماجی۔جزباتی اکتسابی سرگرمیوں میں برابر حصہ لینا مشکل ہوسکتا ہے۔تکنیکی مسائل ایسی سرگرمیوں کے تسلسل میں خلل ڈال سکتے ہیں جو سماجی اور جذباتی مہارتوں کو فروغ دینے کے لیے ڈیزائن کی گئی ہیں۔

۳۔پرائیویسی اور محفوظ ماحول کی کمی: سماجی۔جزباتی اکتساب کے لیے ایک محفوظ ماحول درکار ہوتا ہے جہاں طلباء اپنی بات کھل کر بیان کرنے میں آرام دہ محسوس کریں۔تاہم ڈیجیٹل ماحول میں کبھی کبھار یہ پرائیویسی نہیں ہوتی اور طلباء آن لائن ہم جماعتوں کے سامنے بات کرنے میں ہچکچاتے ہیں کیونکہ انہیں خوف ہوتا ہے کہ کہیں ان کا مذاق نہ اڑایا جائے یا سائبر بلینگ کا سامنا نہ کرنا پڑے۔

۴۔تعاملات میں خود روئی کی کمی: حضوری سماجی۔جزباتی اکتاب ی سرگرمیاں اکثر ان غیر متوقع تعاملات سے فائدہ اٹھاتی ہیں جو ایک فزیکل کلاس روم میں فطری طور پر ہوتی ہیں۔ورچوئل ماحول میں یہ زیادہ منظم محسوس ہوسکتا ہے جس میں بے ساختہ گفتگو، دوستیاں یا جذباتی صورتحال پر بروقت ردعمل کے کم مواقع ہوتے ہیں۔

۵۔اساتذہ کی تربیت کے تقاضے: اساتذہ کو ڈیجیٹل فارمیٹس میں سماجی۔جزباتی اکتساب کو مؤثر انداز میں چلانے کے لیے اضافی تربیت کی ضرورت ہوسکتی ہے۔ڈیجیٹل ٹولز کو اپنانا اور دلچسپ سماجی۔جزباتی اکتسابی مواد تیار کرنا وقت اور محنت طلب ہوسکتا ہے اور اس کے لیے ڈیجیٹل تعلیم میں مہارت درکار ہوتی ہے جو ہر استاد کے پاس نہیں ہوتی۔

۶۔غیر لفظی اشاروں کی نگرانی میں محدودیت: اساتذہ کے لیے طلباء کے غیر لفظی اشاروں کی نگرانی کرنا مشکل ہوسکتا ہے جیسے کہ پریشانی، عدم دلچسپی یا سماجی تنہائی کے اشارے جو عموماً حضوری کلاس میں

آسانی سے شناخت کیے جا سکتے ہیں۔ اس کے باعث اساتذہ کے لیے بروقت تعاون یا مداخلت فراہم کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔

۷۔ اعتماد اور تعلقات بنانے میں مشکل: اعتماد پیدا کرنا اور مضبوط استاد-طالب علم تعلقات بنانا جو کہ سماجی-جزباتی اکتساب کے لیے ضروری ہیں ڈیجیٹل ماحول میں زیادہ چیلنجنگ ثابت ہو سکتے ہیں۔ طلباء آن لائن اپنے اساتذہ اور ہم جماعتوں کے ساتھ کم جڑے ہوئے محسوس کر سکتے ہیں جو سماجی-جزباتی اکتساب کی مؤثر مداخلت کو کمزور بنا سکتا ہے۔

۸۔ خلل اور توجہ کی کمی: ڈیجیٹل ماحول میں خلل کا امکان بڑھ جاتا ہے کیونکہ طلباء اکثر بیک وقت کئی کام کر رہے ہوتے ہیں یا مختلف ٹیبز میں ہوتے ہیں۔ اس سے ان کی توجہ اور سماجی-جزباتی اکتسابی سرگرمیوں میں شمولیت محدود ہو سکتی ہے جو غور و فکر کی ضرورت رکھتی ہیں۔

یہ حدود ظاہر کرتی ہیں کہ اگرچہ ڈیجیٹل پلیٹ فارمز سماجی-جزباتی اکتساب کو کسی حد تک سپورٹ کر سکتے ہیں وہ حضوری سماجی-جزباتی اکتسابی پروگراموں کے اثرات کو مکمل طور پر نقل نہیں کر سکتے۔ جب ممکن ہو تو آن لائن سماجی-جزباتی اکتساب کو کبھی کبھار حضوری تعاملات کے ساتھ جوڑنا ان چیلنجوں کو حل کرنے میں مددگار ثابت ہو سکتا ہے۔

مستقبلی رہنمائی: جیسے جیسے تعلیم کا منظرنامہ ترقی کر رہا ہے ڈیجیٹل کلاس رومز میں سماجی-جزباتی اکتساب کا انضمام طلباء کی جامع ضروریات کا جواب دینے کے لیے بہت اہم ہوگا۔ مستقبل کی تحقیق کو مندرجہ ذیل پر اپنی توجہ مرکوز کرنی چاہیے۔

۱۔ طولانی مطالعات: ڈیجیٹل تعلیم میں سماجی-جزباتی اکتساب کے انضمام کے طویل مدتی اثرات کی تحقیقات کرنا تاکہ طلباء کے نتائج پر اس کے اثرات کو بہتر طور پر سمجھا جا سکے۔

۲۔ جدید تشخیصی طریقے: نئے تشخیصی ٹولز تیار کرنا اور ان کی توثیق کرنا جو مؤثر طریقے سے ڈیجیٹل ماحول میں سماجی-جزباتی اکتساب کی مہارتوں کی پیمائش کریں۔

۳۔ کراس ڈسپلنری نقطہ نظر: سماجی-جزباتی اکتساب کے لیے بین الشعبی نقطہ نظر کی تلاش کرنا جو مختلف مضامین کے ساتھ سماجی-جزباتی اکتساب کو جوڑتا ہے۔ یہ ایک زیادہ مربوط تعلیمی تجربے کو فروغ دیتا ہے۔

نتیجہ:

بالآخر سماجی-جزباتی اکتساب تعلیم کا ایک لازمی جز ہے۔ خاص طور پر ڈیجیٹل کلاس رومز کے تناظر

میں۔ جیسے جیسے اساتذہ آن لائن سیکھنے کے چیلنجوں کا سامنا کر رہے ہیں، سماجی۔جزباتی اکتساب کے طریقوں کے قصداً انضمام سے طلباء کی مشغولیت، جذباتی فلاح وبہبود تعلیمی کامیابی میں بہتری آئے گی۔ معاون ماحول تخلیق کر کے نصاب میں سماجی۔جزباتی اکتساب کوضم کر کے ٹیکنالوجی کا استعمال کرتے ہوئے اور پیشہ ورانہ ترقی کو فراہم کر کے اساتذہ ڈیجیٹل سیٹ اپ میں طلباء کی سماجی اور جذباتی ترقی کوفروغ دے سکتے ہیں۔ جیسے جیسے تعلیم کا عمل جاری رہیگا سماجی۔جزباتی اکتساب کو ترجیح دینا اس بات کو یقینی بنانے کے لیے اہم ہوگا کہ تمام طلباء کو کامیاب ہونے کے لیے ضروری مدد حاصل ہو۔ آگے بڑھتے ہوئے اساتذہ، منتظمین اور پالیسی سازوں کے درمیان تعاون کی ضرورت ہے تا کہ ڈیجیٹل کلاس رومز میں سماجی۔جزباتی اکتساب کے نفاذ کے لیے ایک جامع فریم ورک بنایا جا سکے جو آخر کار طلباء کو فائدہ پہنچائے اور ان کے مجموعی تعلیمی تجربے کو بڑھائے۔

حوالہ جات:

ا۔ڈرلک، جے۔اے .، ویزبرگ، آر۔پی .، ڈائمنسکی، اے۔بی .، ٹیلر، آر۔ڈی .، اور شیلنجر، کے۔بی .(2011) . طلباء کی سوشل اور ایموشنل لرننگ کو بڑھانے کے اثرات: اسکول۔بیسڈ یونیورسل مداخلتوں کا میٹا۔تجزیہ۔ چائلڈ ڈیولپمنٹ، 82(1)، 432-405۔

۲۔یوڈر، این .(2014) . مکمل بچے کی تعلیم: سوشل۔ایموشنل لرننگ کی حمایت کرنے والے تدریسی طریقے تین استاد تشخیصی فریم ورک میں۔ امریکن انسٹیٹیوٹس فار ریسرچ۔

۳۔اکیڈمک، سوشل اور ایموشنل لرننگ کے لیے تعاون .(2021) . شواہد پر مبنی ایس ای ایل پروگرام کیسے اسکول اور زندگی میں زیادہ طلباء کی کامیابی پیدا کرتے ہیں؟

۴۔ویسٹھووین، ایس۔ایم .(2022) . سوشل۔ایموشنل لرننگ: ایک لٹریچر ریویو۔

۵۔ویسٹھووین، ایس۔ایم .(2022) . سوشل۔ایموشنل لرننگ: ایک لٹریچر ریویو۔ اسٹیفن ایف آسٹن اسٹیٹ یونیورسٹی۔

٦۔امریکن سائیکولوجیکل ایسوسی ایشن . کلاس روم کنکشنز: ڈیجیٹل لرننگ میں ایس ای ایل کس طرح تعلقات اور شمولیت کو فروغ دیتا ہے۔

☆☆☆

jammu-o-Kashmir mein school ki taaleem par covid-19 ka asar aur hukumat ke aqdamaat by Dr.Sabreena Javid (Srinagar) cell-7006875969

ڈاکٹر سبرینہ جاوید (سرینگر)

جموں وکشمیر میں اسکول کی تعلیم پر COVID-19 کا اثر اور حکومت کے اقدامات

خلاصہ: جموں اور کشمیر کے مرکزی علاقوں می COVID-19 کی وبائی بیماری نے دوسرے سال میں قدم رکھا ہے اور اسکول کی تعلیم کو بہت نقصان اٹھانا پڑا ہے، حالانکہ حکومت نے اس کے علاج معالجے میں متعدد اقدامات کیے ہیں۔ یہ مطالعہ ثانوی ذرائع کے استعمال سے جموں وکشمیر کے وسطی علاقوں کی اسکول کی تعلیم پر COVID-19 کے اثرات سے متعلق ایک تازہ کاری فراہم کرتا ہے۔ اس مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ حکومت کی مرکزی علاقہ نے متعدد اقدامات اٹھائے ہیں تا کہ طلبہ مختلف پلیٹ فارموں کے ذریعہ گھر پر ہی اپنی تعلیم جاری رکھیں۔ طلباء نے ان اقدامات کو مثبت انداز میں اٹھایا ہے اور اس لئے انہیں فائدہ ہوا۔ یہ انکشاف بھی ہوا ہے کہ وزارت انسانی وسائل کی ترقی کی حکومت ہند نے بھی بہت سے تعلیمی اقدامات اٹھائے ہیں اور جموں وکشمیر کے مرکزی علاقہ نے بھی انہیں خط وروح کے ساتھ نافذ کیا ہے۔ مزید یہ کہ اس مطالعے سے یہ بات بھی سامنے آئی ہے کہ دور دراز اور بورڈر علاقوں میں رہنے والے طلبا کو مختلف آن لائن پلیٹ فارموں کے ذریعہ تعلیم حاصل کرنے کی سہولیات میسر نہیں ہیں، لہذا حکومت کو اس سمت میں فوری اقدامات اٹھانا ہوں گے۔ جموں وکشمیر کے وسطی علاقوں میں اسکول کی تعلیم کے حوالے سے حکومت کی جانب سے بڑے اقدامات کا بہت منتظر ہے۔

ا۔ تعارف: کورونا وائرس (COVID-19) ایک مہلک بیماری ہے اور اس کا پہلا واقعہ 30 جنوری 2020 کو بھارت میں اور میڈیکل کالج جموں میں 9 مارچ 2020 کو ریاست جموں وکشمیر میں رپورٹ کیا گیا۔ اس وبائی امراض نے مزدوروں سے لے کر ٹیکنو تخلیق کاروں تک کے ہر شعبہ ہائے زندگی کے معمولات کا کام روک دیا ہے اور اس نے پری پرائمری مرحلے سے لے کر یونیورسٹی کی سطح تک پوری دنیا کے تعلیمی نظام کو متاثر کیا ہے۔ تجرباتی تحقیق بھی بری طرح متاثر ہوئی ہے۔ بھارت

میں اسکولوں کے ملک بھر میں لاک ڈاؤن کا اعلان 16 مارچ 2020 کو کیا گیا تھا اور مارچ سے اپریل 2021 تک ہندوستان کی بیشتر ریاستوں میں اسکول بند رہے۔ ایک اندازے کے مطابق اس وبائی حالت کی وجہ سے دنیا بھر میں تقریبا 1.5 بلین سیکھنے والے متاثر ہوئے ہیں۔ 15 مئی 2021 تک، یونیسیف کے مطابق، دنیا بھر میں 24 ممالک فی الحال مکمل طور پر لاک ڈاؤن نافذ کررہے ہیں اور اس طرح ٪47 طلبا پر اثر انداز ہورہے ہیں۔ مزید برآں، یونیسکو ممالک کو اسکولوں کی بندش کے اثرات کو بہت سے طریقوں سے کم کرنے میں مدد فراہم کررہا ہے اور اس نے گلوبل ایجوکیشن کولیشن' قائم کیا ہے جو تعلیم کے حق کے تحفظ کے لئے باہمی تعاون کے تبادلے کا ایک پلیٹ فارم مہیا کرتا ہے جس میں تقریبا 175 ممبر ممالک کے درمیان وبائی صورتحال کا سامنا کرنا پڑتا ہے مرکزی خیال، موضوع کے ساتھ دنیا: صنف، رابطے اور اساتذہ۔ بطور 22 مئی، 2021 کو ویڈ 19 وبائی بیماری کی وجہ سے 211، 161، 647 متاثرہ سیکھنے والے ہیں جو 25 ملک بھر میں بند ہونے والے کل اندراج شدہ سیکھنے والوں میں سے ٪12.1 ہیں اور ہندوستان میں اسکولوں کی کل 56 جمع ہفتہ بندش (1)۔

جموں وکشمیر کا تعلیمی نظام بند ہو چکا ہے اور طلبہ پابند ہیں کہ آن لائن تدریس کا انتخاب کریں جس کے علاوہ تعلیم کا کوئی دوسرا طریقہ ممکن نہیں ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ اسکول ایک بچے کے کردار کی تزئین و آرائش کرتے ہیں اور اسکول کے ماحول میں بچہ دولہا ہوتا ہے، اپنے ساتھی ہم جماعتوں کے ساتھ کھیلتا ہے اور مزہ آتا ہے اور اسی وجہ سے بچے پر مثبت نفسیاتی اثر پڑتا ہے۔ کوالٹی تعلیم اقوام متحدہ کے پائیدار ترقیاتی مقصد میں چوتھے نمبر پر ہے جو 2030 تک تمام بچوں کو معیاری بنیادی اور ثانوی تعلیم کی فراہمی کو یقینی بناتی ہے۔ شرح خواندگی، ڈراپ آؤٹ ریٹ، صنفی امتیاز اور روزگار کے لحاظ سے جموں وکشمیر کو تعلیمی لحاظ سے پسماندہ سمجھا جاتا ہے۔ غیر معمولی صورتحال کی وجہ سے بچوں کی ذہنی پریشانی میں مبتلا ہیں اور ایک تحقیق میں یہ بات سامنے آئی ہے کہ 8 سے 14 سال کی عمر میں بچپن کی بیماریوں میں پھیلاؤ 22 سے ٪27 کی حد میں ہے]2[۔ کونسلر فرحانہ یٰسین کے مطابق، سری نگر میں چلڈرن گائیڈنس اینڈ فلاح و بہبود کے مرکز میں، اسکولوں میں توسیع بند ہونے کی وجہ سے بہت سارے طلباء پریشانی کا شکار ہیں اور وادی بھر کے سیکڑوں طلباء نے کونسلر سے ٹیلیفون کے ذریعے ذہنی صحت سے متعلق صلاح مشورے طلب کیے ہیں (3).

اسکولوں کو جموں وکشمیر کے وسطی علاقوں میں مارچ 2020 میں صرف دس دن کے لئے

کھول دیا گیا تھا اور حکومت نے 11 مارچ 2020 سے اسکولوں کو بند رکھنے کا اعلان کیا تھا اور اسکولوں میں کلاسوں کو معطل کرنے والا ہندوستان کا پہلا خطہ بن گیا تھا۔ علاقے میں COVID-19 مثبت واقعات کی مسلسل کھوج کے سبب کلاسز کو پورے سال کے لئے معطل کر دیا گیا تھا۔ تاہم، دسمبر 2020 سے مارچ 2021 کے عرصے کے دوران، مرکزی علاقوں میں سرگرم مقدمات کی تعداد 13 فروری 2021 سب سے کم رہ کر 616 ہوگئی (4)۔ اس کے بعد 11 مئی 2021 کو ایک بار پھر فعال مثبت معاملات کی تعداد 50701 ہوگئی۔ وسطی وقت میں، موسم سرما کی تعطیلات کے بعد یکم مارچ 2021 کو علاقے میں اسکول کھولے گئے تھے، تاہم یونین کے علاقے میں نئے مثبت واقعات کی نشاندہی میں بڑھتے ہوئے رجحان کی وجہ سے، مارچ 2021 کے آخری ہفتے میں، کچھ کا ذکر کرنا۔ کشمیر ڈویژن کے دو اسکولوں میں کم از کم 50 طلباء کا مثبت تجربہ کیا گیا جن میں نورانی پبلک اسکول، خول دمہل ہانجی پورہ، کولگام کے 36 طلباء اور گورنمنٹ میں 14 طلبا شامل تھے۔ ہائی اسکول کٹسو، اننت ناگ کے علاوہ کچھ اساتذہ کا بھی مختلف اسکولوں میں مثبت تجربہ کیا گیا ہے، حکومت نے 5 اپریل 2021ء سے کلاس 9 تک کے اسکولوں کو 2 ہفتوں کی مدت تک بند رکھنے اور ایک ہفتے کے لئے 10 سے 12 کلاسوں کے لئے کلاس ورک معطل (5)۔ خطے میں نئے اور فعال مثبت واقعات کی تعداد میں اضافے کی وجہ سے، اسکولوں کی بندش کو بعد ازاں یونین کے علاقے میں 31 مئی 2021 تک بڑھایا گیا]6[۔

مارچ سے مئی 2020 تک اختتامی وقفے سے لاک ڈاؤن کو مدنظر رکھتے ہوئے، اساتذہ/ والدین نے جموں و کشمیر بھر میں، خاص طور پر دیہی علاقوں میں رضا کارانہ بنیادوں پر کمیونٹی کلاسز کا آغاز کیا ہے۔ ان کمیونٹی کلاسوں کو ایک اور سب نے خوب سراہا، حالانکہ حکومت نے محکموں کے سربراہوں کو آن لائن تعلیم/تعلیم کو یقینی بنانے کے لئے ہدایات جاری کیں ہیں۔ تاہم دیہی علاقوں میں طلباء کو موبائل رابطے کی کمی اور سمارٹ فونز کی عدم فراہمی کی وجہ سے آن لائن تعلیم تک رسائی حاصل نہیں ہے۔ لہذا محکمہ اسکول ایجوکیشن نے COVID-19 معیاری آپریشن کے طریقہ کار (SOPs) پر سمجھوتہ کیے بغیر' ممکنہ علاقوں' میں کمیونٹی کلاسوں کے تسلسل کی اجازت دی ہے (7)۔ اس طرح کی کلاسیں ' کھلے علاقوں اور میدانوں میں منعقد کی گئیں جہاں طلباء مقامی کمیٹیوں اور ایجوکیشن آفیسرز کی نگرانی میں ہر ایک سے کم از کم 2 میٹر کے فاصلے پر بیٹھ سکتے ہیں۔ تاہم، مثبت واقعات کی تعداد میں اضافے کی وجہ سے ایسے بیشتر اسکول بند کر دیئے گئے تھے اور حکومت کے پاس

خاص طور پر دور دراز اور سرحدی علاقوں کے طلباء کے لئے تدریسی/ سیکھنے کے دیگر طریقوں کو منتقل کرنے کا کوئی دوسرا آپشن نہیں ہے۔ مثال کے طور پر، 2020 میں دوردرشن (ڈی ڈی) اور آل انڈیا ریڈیو (اے آئی آر) نے بہت سارے موضوعات پر آدھے گھنٹے کے دورانیے کے پروگراموں کو باقاعدگی سے ٹیلی کاسٹ کیا ہے اور اسے علاقائی چینل ڈی ڈی کشمیر میں بھی دہرایا گیا ہے۔ دور دراز علاقوں کے طلبا کو درپیش مشکلات کو مدنظر رکھتے ہوئے حکومت نے مئی 2021 کے مہینے میں ڈی ڈی اور اے آئی آر کے ساتھ ان طلباء کے لئے لیکچر ٹیلی کاسٹ کرنے کے لئے ایک بار پھر گفتگو کا آغاز کیا ہے(8).

موجودہ دور انفارمیشن ٹکنالوجی (آئی ٹی) کی عمر ہے اور ایک اندازے کے مطابق انٹرنیٹ صارفین سن 2016 میں 40 کروڑ سے بڑھ کر 2021 تک 73 کروڑ ہو جائیں گے(9)۔ لہذا، انفارمیشن ٹکنالوجی اور آن لائن انٹرنیٹ کا استعمال اور ڈیجیٹل اقدامات مستقبل میں تعلیم کے شعبے میں انقلاب لانے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ آن لائن تعلیم کے لئے ٹکنالوجی کا استعمال اور تمام ڈیجیٹل اقدامات کے آنے والے مستقبل میں مکمل تعلیم کے منظرنامے میں انقلاب لانے کا امکان موجود ہے۔ اس سمت میں حکومت ہند نے آئی ٹی کی طاقت کو وسعت کے توسیع کے مواقع میں ترجمہ کرنے کے لئے آئی سی ٹی (NMEICT) کے ذریعہ تعلیم کا قومی مشن شروع کیا ہے۔ مزید برآں، ملک کے طلباء / سیکھنے والوں کے تحفظات کو مدنظر رکھتے ہوئے وزارت انسانی وسائل کی ترقی (MHRD)، حکومت۔ ہندوستان کے 20 سے زیادہ ڈیجیٹل پلیٹ فارم شروع کر چکے ہیں اور ان میں سے کچھ سوئم، سوئم پربھا، نیشنل ڈیجیٹل لائبریری (جس میں تقریبا 6.5 ملین کتابیں شامل ہیں)، نیشنل اکیڈمک ڈپازٹری، این پی ٹی ای ایل، ای پتھشالہ اور این آر او آر ہیں۔ ایم ایچ آر ڈی کے علاوہ طلبہ کے ذریعہ کمیونٹی کی "کیش لیس کیمپس" اور ڈیجیٹل فنانشل خواندگی کا آغاز بھی ہوا ہے۔ تاہم یہ بات قابل ذکر ہے کہ ہندوستان میں ایک اندازے کے مطابق نوجوان ممبروں کے ساتھ صرف 8٪ گھروں میں ہی کمپیوٹر کے پاس نیٹ لنک موجود ہے(10) . خاص طور پر جموں وکشمیر یونین علاقہ کے دیہی علاقوں میں طلباء کے پاس ڈیجیٹل وسائل جیسے لیپ ٹاپ، موبائل فون وغیرہ کی کمی ہے اور اسی وجہ سے انہیں آن لائن تعلیم تک رسائی حاصل نہیں ہے۔ لہذا وقت کی ضرورت ان طلبا کو آن لائن تعلیم کے لئے درکار الیکٹرانک ڈیوائس فراہم کر کے ان تک رسائی فراہم کرنا ہے۔

۲) مطالعے کے مقاصد: پہلا۔ جموں وکشمیر میں اسکول کی تعلیم پر COVID-19 کے اثرات کو

دریافت کرنا۔

دوسرا۔COVID-19 لاک ڈاؤن کی وجہ سے اسکول کی تعلیم کو ہونے والے نقصان کو دور کرنے کے لئے محکمہ اسکول ایجوکیشن کے اقدامات کا خلاصہ پیش کرنا۔

۳) ریسرچ کا طریقہ: اس مطالعے میں جن اعداد و شمار کا ذکر کیا گیا ہے وہ ثانوی ذرائع جیسے ویب سائٹ، میگزین، ریسرچ جرائد، سرکاری ویب سائٹیں، آرکائیوز اور اخبارات اور اسکول کے تعلیمی نظام پر 19-DIVOC کے اثرات سے متعلق ای مشمولات کے ذریعہ اکٹھا کیا گیا تھا۔ 19-DIVOC وبائی بیماری اور اس کے بعد حکومت کی طرف سے وقتاً فوقتاً عائد پابندیوں کی وجہ سے فیلڈ سروے اور گروپ ڈسکشن کے طور پر بنیادی اعداد و شمار اکٹھا نہیں کیا جا سکا۔

۴) اسکول کی تعلیم کو جاری رکھنے کے سلسلے میں COVID-19 لاک ڈاؤن کے دوران حکومت کی جانب سے اٹھائے گئے اقدامات۔

آج کا دور انفارمیشن ٹکنالوجی کا دور ہے، اور ڈیجیٹل انڈیا کے اس دور میں ٹکنالوجی کے ماہرین، ماہرین تعلیم اور بہتر انتظامیہ کی مدد سے آج کل ای پلیٹ فارم کو بڑے پیمانے پر استعمال کیا جا رہا ہے تاکہ درس و تدریس/تشخیص، فروغ اور احترام کے ساتھ رہنمائی فراہم کی جا سکے۔ کیریئر اور جگہ کا تعین کرنے کے لئے. ایسی سہولیات بغیر کسی کم خرچ کے چوبیس گھنٹے دستیاب ہیں۔ مسلسل لاک ڈاؤن کی وجہ سے تعلیمی نقصان کو کم کرنے کے لئے، جموں و کشمیر کی مرکزی سرزمین سرکار نے طلباء کی تعلیم کے بہت سے طریقوں جیسے ماہرین تعلیم، رہنمائی اور مشاورت، تناؤ کے انتظام اور کیریئر رہنمائی کے لئے بہت سے اقدامات اٹھائے ہیں۔ محکمہ اسکول ایجوکیشن نے جو اقدامات کیے ہیں وہ ذیل میں دیئے گئے ہیں

ایک) جموں و کشمیر نالج نیٹ ورک (جے کے کے این)

اس اقدام کے تحت حکومت کا مقصد جموں و کشمیر کے اسکول کے بچوں کو انٹرنیٹ سے جوڑنا ہے اور یہ پورٹل اسکول کے طلباء کی تمام کلاسوں کے لئے تقریباً تمام مضامین میں ای مشمولات فراہم کرتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ اساتذہ کو ای مشمولات کی تخلیق میں شامل تکنیکی معاونت بھی فراہم کرتا ہے۔ مزید برآں، یہ نیٹ ورک تعلیمی میدان میں ہونے والی سرگرمیوں اور کیریئر سے متعلق معلومات کے لئے یونین کے علاقے میں اعلیٰ اور اعلیٰ ثانوی اسکولوں کی ایک بڑی تعداد کو جوڑتا ہے۔

دو) منزیلین: سمگر اسکشا کے تعاون سے جموں و کشمیر اسکول ایجوکیشن ڈیپارٹمنٹ نے طلباء کو کیریئر

کی رہنمائی فراہم کرنے کے لئے یہ اقدام شروع کیا ہے۔ اس پروگرام کے تحت طلبہ قومی اور بین الاقوامی کالجوں کے پیشہ ورانہ اور پیشہ ورانہ کیریئر، داخلے کے امتحانات اور اسکالرشپ کے مواقع کے بارے میں معلومات تک رسائی حاصل کر سکتے ہیں۔

تین) آو بات کریں: یہ ایک ٹیلی کونسلنگ ہیلپ لائن ہے جو موبائل کے تحت ڈائریکٹر اسکول ایجوکیشن جموں نے شروع کی تھی۔ خاص طور پر چھٹی سے بارہویں جماعت کے طلباء، اساتذہ، والدین کے مختلف علمی سرگرمیوں، پریشانی، ای وسائل، وغیرہ کے سوالات کو سنبھالنے اور ترجیحی بنیادوں پر مسائل اور مسائل کو حل فراہم کرنے کے لئے۔

چار) طلبا قابل رسائی ریسورس اور لرننگ ایپ (SARAL): ڈائرکٹوریٹ آف اسکول ایجوکیشن جموں کے ذریعہ لانچ کی جانے والی یہ متحرک سیکھنے والی اینڈرویڈ ایپلی کیشن ہے، جو جموں وکشمیر بورڈ آف اسکول ایجوکیشن کے نصاب کے مطابق مضامین کے ماہرین کے ذریعہ ریکارڈ کردہ تمام کلاسوں اور مضامین سے متعلق ویڈیوز کا ذریعہ ہے۔ اس کے علاوہ اس میں گھریلو اسائنمنٹس اور متعدد دیگر سرگرمیوں کا ذخیرہ بھی ہے جس میں تجویز کردہ نصاب کے مطابق ہے۔

پانچ) سمادھن: یہ ایک ویب پر مبنی شکایات کا انتظام ڈائریکٹوریٹ آف اسکول ایجوکیشن کے ذریعہ شروع کیا گیا تھا تاکہ اساتذہ، طلباء اور والدین سے شکایات موصول ہوسکیں اگرچہ اس طریقہ کار سے اوران کی فوری ازالہ کی فراہمی کی جاسکے۔ مزید برآں، یہ پروگرام واٹس اپ، موبائل ایپ، ٹی وی، ریڈیو کے ذریعے قابل رسا ہے اور اس میں انٹرنیٹ پر وضاحت ویڈیوز، پریکٹس سوالات، تشخیصات، پی ڈی ایف فارمیٹ میں ای ٹیکسٹ بک، سبق کے منصوبے، سلائیڈ اور ریکارڈ شدہ کلاس روم شامل ہیں۔

چھ) ہوم کلاسز: محکمہ اسکول ایجوکیشن جموں نے لاک ڈاؤن کے فورا بعد ہی ایک میگا پروجیکٹ کا آغاز کیا ہے تاکہ طلباء کو گھر، انٹرنیٹ، ٹی وی، ریڈیو اور موبائل فون کے ذریعے اپنی تعلیم جاری رکھے۔ اس پروجیکٹ کے تحت تقریبا 7000 ویڈیو لیکچرس تشکیل دیئے گئے ہیں اور وہ طلباء کو دستیاب کرائے گئے ہیں۔ اس پروگرام کے تحت مختلف سب اسٹیشنوں سے پراسر بارٹی کے ذریعہ ریڈیو کلاسز چلائی گئیں، اس پروگرام کے تحت ہفتہ وار ہوم اسائنمنٹ اور آن لائن کوئز اور دیگر مقابلے بھی کروائے گئے۔

سات) ریڈیو کلاسز اور ٹیلی کلاسز: ایک ہفتے میں 5 دن کے لئے میرچی 98.3 کے اشتراک سے ریڈیو کلاسز کا انعقاد کیا گیا، اس کے علاوہ نویں سے 12 ویں کلاس کے طلباء کو لیکچر دینے کے لئے مقامی

ٹی وی چینلز کی خدمات بھی حاصل کی گئیں اور اس میں نباتات، زولوجی، کیمسٹری اور انگریزی جیسے مضامین کا احاطہ کیا گیا۔

آٹھ) ورچوئل فیلڈ سپورٹ: اس اقدام کے تحت طلبا اپنے گھروں میں کہانیاں سن سکتے تھے۔ اس سے مختلف سرکاری اسکیموں کے اعداد و شمار جمع کرنے میں بھی مدد ملتی ہے اور یہ بچوں، اساتذہ اور محکمہ تعلیم کے عہدیداروں کے لئے مفید ہے۔

نو) مفت ٹیبز کی تقسیم: اس اقدام کے تحت جموں و کشمیر کے مختلف اسکولوں میں 2500 سے زیادہ ٹیبز (sbaT) تقسیم کی گئیں اور ان ٹیبز کی مدد سے طلباء کو آن لائن کلاسز اور دستیاب مواد کی رسائی حاصل ہوگ ء پیلیٹ فارم کی مختلف شکلوں پر جیسے ای پاٹھشالہ، ڈِکشا وغیرہ۔

دس) آو پاوٗڈین: اس اقدام کے تحت اسکول کے طلباء کے لئے ای مواد اور ویڈیو کلاسیں اسکول تک پہنچائی جاتی ہیں، تا کہ وہ گھر میں رہ کر اپنی تعلیم جاری رکھ سکیں۔

گیارہ) چائلڈ لائن: حکومت جموں و کشمیر نے 24 گھنٹے کے لئے ایک مفت ہنگامی فون چلڈرن 1098 شروع کیا ہے، جو لاک ڈاؤن کے دوران ضرورت مند بچوں کو امداد اور مدد فراہم کرتا ہے تا کہ ان کے مسائل کے لئے فوری کارروائی کی جائے۔

5) نتائج: جمہوریہ کے وسطی علاقے جموں و کشمیر میں COVID-19 وبائی امراض نے اسکول کی تعلیم کو بری طرح متاثر کیا ہے۔ مارچ 2020 سے اپریل 2021 تک طلباء نے ایک ہفتہ یا اس سے زیادہ مشکل سے اسکولوں میں تعلیم حاصل کی۔ حکومت جموں و کشمیر خصوصا محکمہ اسکول ایجوکیشن نے محکمہ تعلیم اور انفارمیشن ٹکنالوجی کے ماہرین کی مدد سے طلبا کو گھریلو تعلیم انٹرنیٹ کے ذریعے فراہم کرنے کے لئے متعدد جدید اقدامات اٹھائے ہیں۔ اگرچہ حکومت نے ہر ایک بچے/سیکھنے والے تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کی، لیکن دور دراز اور بورڈر علاقوں سے آنے والے طلباء کو ان مختلف تدریسی پلیٹ فارموں تک بہت کم یا کوئی رسائی حاصل نہیں ہے، لہذا ان طلبا کو معیاری تعلیم کی فراہمی کے لئے ترجیحی بنیادوں پر اقدامات کیے جانے چاہیں۔ ٹھیک ہے، تا کہ وہ اس وبائی مرض میں اپنی تعلیم جاری رکھیں۔

6) حوالہ جات:

[1] UNESCO: Education from Disruption to Recovery, 7 place de Fontenoy, 75007,

Paris France, 22 May, 2021

https://en.unesco.org/covid19/educationresponse

[2] Sheikh Shoib, S. M. Yasir Arafat, Mental health in Kashmir: conflict to COVID-19, Public Health, 187, 2020, 65-66.

[3] Nusrat Sidiq, A Year Without School in Kashmir, Anadolu Nadolu, Agency, Eti Mahallesi GMK Bulvar? No:132

Çankaya ANKARA, Turkey

Https://www.aa.com.tr/en/asia-pacific/a-year-without-school-in-kashmir/1931973

[4] Wikipedia, Article, COVID-19 Pandemic in Jammu and Kashmir, May 2021

https://en.wikipedia.org/wiki/COVID-19_pandemic_in_Jammu_and_Kashmir#March_2021

[5] 50 students of two Jammu and Kashmir schools test positive for COVID-19,

Hindu News Paper, 31 March, 2021.

https://www.thehindu.com/news/national/other-states/coronavirus-50-students-of-two-jammu-and-kashmir-schools-test-positive/article34208701.ece

[6] Bhoomika Aggarwal, Jammu And Kashmir Schools, Colleges To Remain Closed Till May 31,

NDTV Education, May 2, 2021.

https://www.ndtv.com/education/jammu-and-kashmir-schools-colleges-remain-closed-till-may-31

[7] Standard operating procedures (SOP) for conducting "Community Classes" by volunteer teachers

and parents of JK UT, Circular No. 04 Edu of 2020 dated: 27-07-2020

http://www.jkeducation.gov.in/circluar0427072020.pdf

[8] Students in rural areas of J&K remain deprived of online education,

JKNEWSLINE, 16 May 2021.

https://jknewsline.com/students-in-rural-areas-of-jk-remain-deprived-of-online-education/

[9] Dushyant Pradeep, Digital initiatives for students, Daily Excelsior, 24 May, 2020

https://www.dailyexcelsior.com/digital-initiatives-for-students/

[10] Protiva Kundu, Indian education can't go online - only 8% of homes with young members have computer with net link, Scroll.in, May 5, 2020

https://scroll.in/article/960939/indian-education-cant-go-online-only-8-of-homes-with-school-children-have-computer-with-net-link

(۱) یونیسکو: تعلیم سے خلل سے بازیافت، 7 مقام ڈی فونٹینئی، 75007، پیرس فرانس، 22 مئی، 2021

https://en.unesco.org/covid19/educationresponse

(۲) شیخ شعیب، ایس ایم یاسر عرفات، کشمیر میں دماغی صحت: تنازعہ COVID-19، صحت عامہ، 187، 2020، 65-66۔

(۳) نصرت صدیق، ایک سال بغیر اسکول میں کشمیر، انادولونڈولو، ایجنسی، ایڈ محلسی جی ایم کے بلویر نمبر: 132 انکار، ترکی

https://www.aa.com.tr/en/asia-pacific/a-year-without-school-in-kashmir/1931973

(۴) ویکی پیڈیا، آرٹیکل، COVID-19، جموں وکشمیر میں وبائی امراض، مئی 2021

https://en.wikipedia.org/wiki/COVID-19_pandemic_in_Jammu_and_Kashmir#March_2021

(۵) جموں وکشمیر کے دو اسکولوں کے 50 طلباء کوویڈ 19 مثبت پائے گئے۔ ہندو نیوز پیپر، 31 مارچ، 2021.

https://www.thehindu.com/news/national/other-states/coronavirus-50-students-of-two-jammu-and-kashmir-schools-test-positive/article34208701.ece

(۶) بھومیکا اگروال، جموں کشمیر اسکول، کالجو 31 مئی تک بند رہیں گے۔ این ڈی ٹی وی ایجوکیشن، 2 مئی، 2021۔

https://www.ndtv.com/education/jammu-and-kashmir-schools-colleges-remain-closed-till-may-31

(۷) جے کے یوٹی کے رضا کار اساتذہ اور والدین کے ذریعہ " کمیونٹی کلاسز " کے انعقاد کے لئے معیاری آپریٹنگ طریقہ کار (ایس او پی)، 2020 کا سرکلر نمبر udE04 تاریخ: 27-07-2020

http://www.jkeducation.gov.in/circluar0427072020.pdf

]8[جموں وکشمیر کے دیہی علاقوں میں طلباء، آن لائن تعلیم سے محروم ہیں۔

16 مئی 2021، جے کے نیوز لائن

https://jknewsline.com/students-in-rural-areas-of-jk-remain-deprived-of-online-education/

(۹) دشیانت پردیپ،طلبا کے لئے ڈیجیٹل اقدامات،روزنامہ ایکسلسیئر ،24 مئی،2020

https://www.dailyexcelsior.com/digital-initiatives-for-students/

(۱۰) پرویوا کنڈو،ہندوستانی تعلیم آن لائن نہیں جاسکتی ہے۔صرف 8 فیصد نوجوانوں کے پاس کمپیوٹر ہے جس میں نیٹ لنک ہے،اسکرول ڈاٹ،5 مئی،2020

https://scroll.in/article/960939/indian-education-cant-go-online-only-8-of-homes-with-school-children-have-computer-with-net-link

☆☆☆

Akhtarul Imaan ki Nazmon ke Imteyazi pahlu by Dr.Sabreena Javid

(Srinagar) cell-7006875969

ڈاکٹر سبرینہ جاوید (سرینگر)

اختر الایمان کی نظموں کے امتیازی پہلو

اختر الایمان بیسویں صدی کے ان چند اہم شاعروں میں شمار ہوتے ہیں جنہوں نے غزل کے مقابلے میں نظم گوئی کو اپنا شعار بنایا اور اُسی پر قائم رہے۔ غزل اور روایتی رومانیت سے انحراف کا آغاز یوں تو حالی کے دور سے ہم ہؤا تھا اور عظمت اللہ کان نے غزل کے بے دریغ گردن مار دینے کا مشنوئی بھی دیا تھا لیکن اس کے باوجود بیشتر شاعر غزل سے اپنا دامن نہیں چھڑا سکے۔ ترقی پسندوں نے بھی غزل سے اصولی اختلاف کیا تھا لیکن پھر وہ کسی اصول مناہمت کے بغیر غزل کہنے لگے۔ لیکن اختر الایمان پر دور میں نظم کے تئیں اپنے کمٹمنٹ پر قائم رہے۔ غزلیہ عناصر اور چٹمارے سے نظم کو آزاد کرنے کی جتن کرتے رہے اور غزل کی زلفوں کے اسیر قاری کو نظم کی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ اس کے لیے انھیں تقریباً اپنے ہر نئے مجموعے میں نظم کے دفاع میں کچھ نہ کچھ کہنا پڑا۔ چنانچہ آب جو کے دیباچے مین انھوں نے شاعری کی اس تنقید پر پہلا نتیکھا وار کیا جو نظم کے مقابلے میں غزل کی دلدادہ تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ مختلف سمتوں سے مخالفت کے باوجود اختر الایمان نے ثابت قدمی کا مظاہرہ کیا اور بلا آخر نظم کو اپنی شناخت کا وسیلہ بنایا اور یوں اپنی تخلیقی توانائی کے بل پر ترقی پسندوں کے ساتھ ساتھ جدیدیوں کو بھی اپنا معترف بنایا۔

1943ء میں اختر الایمان کی شاعری کا پہلا مجموعہ ''گرداب'' شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد ان کے پکے بعد دیگر سات شعری مجموعے شائع ہوئے۔ تاریک سپارہ، سب انگ، آب جو، یادیں، بنت لمحات، نیا آہنگ اور زمین زمین۔

1988ء میں ان کا کلیات ''سروسامان'' کے نام سے منظرِ عام پر آیا۔ اپنے پورے سفر میں تقریباً پچاس سال کو محیط ہے۔ اختر لایمان نے نظم میں ہیت اور موضوع کے ایسے تجربے کیسے جن میں سے بیشتر ان ہی سے مخصوص ہیں۔ غزل کی سخت جاں فضا میں نظم کے بل بوتے پر

اپنی عظمت عنوان تو رایک کارنامہ ہے۔ چنانچہ شمس الرحمان فاروقی نے انہیں نئی شاعری کا باور آدم کہا ہے اور اس وقت کا سب سے بُرا شاعر قرار دیا ہے۔ جن کے یہاں نہ کسی معاصر یا پیشرو کا رنگ جھلکتا ہے اور نہ ہی جن کے اسلوب کی نقل کی زیادہ گنجائش ہے۔

اختر الایمان کا شعری مجموعہ یادیں اپنے نام کی رو سے پہلی ہی نظر ہیں۔ ماضی کے حوالے سے احساس دِلاتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اختر الایمان کی نظم نگاری میں ماضی ایک اہم مولف کی حیثیت رکھتا ہے۔ حال کی تلخیوں اور بے رحم حقیقتوں کے ادراک کے نتیجے میں ماضی ایک آئینے کا درجہ رکھتا ہے۔ اور اس آئینے میں حال کی صورت زیادہ عیاں بن جاتی ہے۔ یادوں کا سلسلہ اختر کی شاعری میں اس قدر اہمیت رکھتا ہے کہ تجربہ اور خیال شعری صورت میں ڈھل جانے سے پہلے قبل یاد کا رنگ اختیار کر لیتا ہے۔ باز آمد جیسی نظمیں اسی حقیقت کو واضح کرتی ہیں کہ اختر الایمان اقدار روریات اور عقائد ونظریات کے زوال اور معاشرتی زندگی پر اس کے اثرات کا شدت سے احساس کرتے ہیں۔ شاعر احساس کو اظہار کی سطح پر ماضی اور حال کے ایک غیر محسوس مقابل کے ذریعے پیش کرتے ہیں۔ گزرے ہوئے لمحوں کی یادیں موجود لمحے میں احساس زباں کا باعث بن جاتی ہیں اور احساسِ زبان اختر الایمان کی متعدد نظموں کا مرکزی نقطہ ہے۔ اختر انصار ینے کہا تھا۔

یادِ ماضی عذاب ہے یارب چھین لے مجھ سے حافظہ میرا

ماضی کی یادیں عذاب بن جاتی ہیں جب حال کے مقابلے میں یہ یادیں حسین وجمیل ماضی سے متعلق ہوں لیکن اختر الایمان کا شاعری میں ماضی کا جو تصور ملتا ہے وہ عہید رفتہ کے ان حسین وجمیل لمحات کا نہیں جو ہر لحاظ سے اطمنان بخش رہا ہو۔ ان کے یہاں ماضی اپنے تمام نشیب وفراز، حسن وقبح اور اپنی ساری تلخیوں اور شیرنیوں کے ساتھ یادوں کی صورت میں سامنے آتا ہے اس مانی میں ماضی بعدی بھی شامل ہے جو اجتماعی لاشعور کی صورت میں شاعر کے تجربوں کی تشکیل کرتا ہے اور ماضی قریب بھی جو شاعر کی خود اپنی زندگی کے تجربات، بچپن کی معصومیتوں اور اس کے گرد وپیش سے صورت پذیر ہوا ہے۔ ماضی کی ہر دو حیثیتوں میں اپنی شعری کائنات میں لمبا کر اختر الایمان اپنے شعری تجربوں کو اتنا وعطا کرتے ہیں۔ ان کا حکایتی یا افسانوی اسلوب بھی دراصل ماضی کی اسی بازگشت کا نتیجہ ہے۔

اختر الایمان کی شاعری میں ایک مستقل موضوع کی حیثیت رکھتا ہے۔ وقت کے آگے شاعر کی بے بسی ایک فکری امر ہے لیکن اس کی بے رحمی کے خلاف کم از اپنا احتجاج درج کرنا اس کا

حق بن جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اختر الایمان کے یہاں ماضی اور حال کی دہشتناکیوں کا جو گہرا احساس ملتا ہے اس جیسا قنوطی رنگ اس زیادہ طنز و استہزا کا رنگ ملتا ہے۔ اختر الایمان کا تاریخی شعور جذباتی اندزا کا نہیں بلکہ سنجیدہ فکر کا حامل ہے۔ وارث علوی نے اس سلسلے میں بڑے پتے کی بات کی ہے۔

''اپنے وقت کے عام شاعروں میں اختر الایمان کا سروکار تاریخیت سے زیادہ ہے۔ اسٹیفن ڈیڈاکس کی مانند تاریخ ان کے لیے کوبوس میں بدل گئی ہے۔ اپنے وقت اور اپنے عہد کے خلفشار اور انتشار کا ایسا جُورس بیان نہیں نہیں ملے گا۔ ہر چیز کو وقت کے تناظر میں دیکھنے والا ذہن یہ جاننے کے باوجود کہ خبیث روموں کا جو ڈراما تاریخ کے اسٹیج پر کچلا جا رہا ہے وہ نہ پہلی بار کچلا گیا نہ ہی یہ اس کا آخری نظر ہے۔ وہ اس منظر کے خاموش تماشائی نہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ وقت اور تاریخ ان کی نیک خواہشوں اور آرزؤں کا کوئی خیال کیے بغیر گزر جائے گی۔ وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ تاریخ کی باگ موڑنے کی طاقت ان میں نہیں۔ لیکن وہ تاریخ کے شاہس ہیں اور جریدہ وقت پر اپنا احتجاج ثبت کیے بغیر وہ تاریخ کو روندتے ہوئے گزر جانے کا موقع نہیں دیے۔ اختر الایمان پتھرائی ہوئی آنکوں سے تاریخ کے ہولناک کھیل کو دیکھتے ہیں آنکھ سے آنسو نہیں گرتا لیکن جگر خون ہوجاتا ہے جو ان کی شاعری کی حنابندی کے کام آتا ہے۔''

اختر الایمان کی معتدد نظمیں ایسی ہیں جن میں تجربے کی بنیاد یاد پر اُستوار ہے یوں بھی اختر الایمان نے اپنے شعری عمل کے بارے میں اس بات کا اظہار کیا ہے کہ کوئی بھی بات انمیں فی الفور شعر کہنے پر نہیں اکستاتی بلکہ کافی دیر تک ان کے احساس پر حاوی رہتے ہوئے ان کی تخلیقی شخصیت کا جزو بن جاتی ہے۔ اور تب کہیں اظہار کے پیرائے میں آجاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ سارا عمل واقعات و تجربات کو یادوں میں بدل جانے کا عمل ہے۔ اختر الایمان لکھتے ہیں۔

ا۔ جو کچھ میں نے لکھا وہ اس قت نہیں لکھا جب ان تجربات اور محسوسات کی منزل سے گزر رہا تھا۔ جو میری نظموں کا موضوع ہیں، انمیں اس وقت قلمبند کیا ہے جب وہ تجربات اور محسوسات یادیں بن گئے تھے۔ جب ہر نشتر کے لگائے ہوئے زخم مندمل ہوگئے تھے۔ ہر طوفان گزر کر سطح ہموار ہوگئی تھی۔ اور ہر رفتہ اور گزشتہ تجربہ کی صدائے بازگشت مجھے یوں محسوس ہو رہی تھی جسے مین ان سے وابستہ بھی ہوں اور نہین بھی۔ یہی وجہ ہے کہ میری بیشتر شاعری مین یاد کا سا رنگ ہے۔

۲۔1) وارث علوی۔ اختر الایمان کی شاعری کے چند پلو

۲) اختر الایمان۔ دیباچہ زمین زمین

اختر الایمان کے پہلی زندگی، حیات و کائنات اور اقداری نظام کی بدلتی ہوئی صورت حال سے متعلق تجربات کا اظہار زیادہ تر گزراں لمحے کو گرفت میں لے کر ہی ممکن بنا ہے۔ اس سلسلے مُن ایک لڑکا، یادیں، مسجد، عمر گریزاں کے نام اور بسی دیوار چمن بطور خاصا اہمیت رکھتی ہیں۔

نظم ''ایک لڑکا'' جسے اردو کے بیشتر ناقدین نے اختر الایمان کی شاہکار نظم قرار دیا ہے، بقولِ شاعر بچپن کے ایک ایسے واقعے پر استوار ہے جو یاد کی صورت مین اس کے شور کو کچو کے لگا تار ہا ہے۔ نظم میں ماضی، حال پر ایک بھر پور طنز کی صورت میں نمودار ہوتا ہے۔ نظم کا ابتدائی حصہ ماضی کا وہ معصوم منظر ہے جہاں نیچر انسانی حرص وحوس کی زد سے بچا ہُوا ہے۔ لڑکا اس معصوم منظر میں ابھرتا ہے۔ وہ فطرت، معصومیت اور نیچر کے حُسن میں جذب ہے۔

اختر الایمان کی شاعری میں جہاں یادوں کے دلکش نقوش ابھرتے ہیں وہیں ان کی شاعری میں ان کا حکایتی اندازِ بیان انھیں اپنی طرز کا اوکھا شاعر بھی بنا دیتا ہے۔ اپنی شاعری میں قاری کی شمولیت کو یقینی بنانے کے لیے بھی اس طرح کا انداز موثر اور کارگر ہے۔ اختر الایمان نے جس لطافت کے ساتھ اپنی نظموں مین حکایتی انداز کو برتا ہے وہ ان ہی سے مخصوص ہے۔ ماضی کی بازگشت اور یادون کے تخلیقی بیان نے اختر الایمان کے یہاں جس چیز کو سب سے بڑھکر راہ دی ہے وہ ان کا حکایتی انداز ہے۔ نظموں میں کہانی پن کا عُنصر تو اکثر شاعروں کے یہاں ملتا ہے لیکن اختر الایمان کے معاصرین اور نا کے بعد اردو کے کسی اور نظر نگار نے اپنی نظموں میں مسلسل طور پر اس طرز کو نہیں برتا۔ اس کی بنیادی وجہ یہی ہے کہ گزشتہ واقعات کا بیان ایک کہانی کی صورت میں ہی زیادہ موثر معلوم ہوتا ہے۔ اور یون بھی اس نوع کا بیان کہانی کا سا انداز ہی رکھتا ہے۔ اختر الایمان کی بعض نسبتاً طویل نظموں میں یہ عنوان نظموں کو بے کیف ہونے سے بچاتی ہیں اور قاری وحدت تاثر کی وجہ سے کسی نوع کی اکتاہٹ محسوس نہیں کرتا۔

اختر الایمان نے اس طرح کا انداز اپنی بہت ساری نظموں میں اپنایا ہے۔ ان کی مشہور نظم ''ایک لڑکا'' پڑھ کر لگتا ہے کہ جیسے وہ کوئی گزری کہانی سُناتا ہے۔

؎ دیارِ مشرق کی آبادیوں کے اونچے ٹیلوں پر

اس مصرے سے لیکر اس ''پرندوں کی طرح شاخوں میں چھپ کر جھولتا مڑتا''۔

مصرے تک کہانی منظر یہ ہے اور کہانی سنانے والا (یعنی متکلم) اس خوبصورت منظر

میں ایک معصوم لڑکے کے پیکر کو خلق کرتا ہے جو ان مناظر سے لطف اندوز بھی ہوتا ہے اور کہانی گو کا ہمراز بنا کر اس کے ساتھ ساتھ ہر جگہ موجود رکھی رہتا ہے۔

اس کے بعد کہانی نے ایک نیا موڑ لیا ہے اور سامع کی دلچسپی اور بھی بڑھ جاتی ہے۔

مجھے اک لڑکا آوارہ منشی آزاد سیلانی
مجھے اک لڑکا جسے تند چشموں کا رواں پانی
نظر آتا ہے یوں لگتا ہے جسے یہ ملائے جان
میرا ہمزاد ہے، ہر گام پر ہر موڑ پر جولاں
اسے ہمراہ پاتا ہوں، یہ سائے کی طرح میرا
تعاقب کر رہا ہے جیسے میں مقرور ملزم ہوں
یہ مجھ سے پوچھتا ہے اختر الایمان تم ہی ہو؟

اختر الایمان کی اس طرح کی متعدد نظموں میں بعض مخصوص مصرعوں کی دلچسپی تاثیر اور کشش میں اضافہ کر دیتی ہے۔ مثلاً نظم۔ ''یادیں'' میں اس مصرے کی تکرار۔

دیکھو ہم نے کیسے بسر کی اس آباد ضرابے میں۔

نظم ''یادیں' ماضی سے حال تک فرد کی زندگی کیپورے سفر کی روداد ہے اور آباد قرابے یعنی زندگی یا دنیا میں اس کی گزر بسر کے بدلتے ہوئے رنگوں کا ایک نگار خانہ ہے جہاں ایک ایک پار ایک ایک احساس بن کر کہانی کے مختلف اور متنوع واقعات کی نمائندگی کرتا ہے۔

شمس الرحمٰن فاروقی نے اپنی کتاب ''سفر'' غیر شعر اور نثر میں اختر الایمان کے ڈرامائی طرزِ بیان کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ کم از کم اس وقت کے سب سے پہلے اور آخری ڈرامانگار ہیں۔ شعر کو یا تو گایا جا سکتا ہے یا اس کی قرأت ہو سکتی ہے۔ اختر الایمان ہمارے واحد شاعر ہیں جنکی شاعری بولی جا سکتی ہے۔ اختر الایمان کی وابستگی فلموں سے بھی تھی۔ لہذا کچھ لوگوں نے کہا کہ ان کے یہاں یہ ڈرامائی انداز اسی وابسگتی کے پیش نظر آیا ہوگا۔ مگر بقول بیدار نجت یہ خیال اس لیے درست نہیں ہے کہ یہ ڈرامائی انداز تو ان کی اولین نظموں میں بھی ہے۔ مثلاً موت، مداع، جمود اور پھر ان کی طویل نم 'سب رنگ' بھی ہے۔ بیدار نجت لکھتے ہیں:

''یہ سب نظمیں 1944ء سے پہلے کی ہیں جب اختر الایمان فلمی دنیا سے وابستہ نہ تھے۔ اختر الایمان کے شعر میں ڈرامائی انداز تو فلموں سے نہیں آیا، ہاں انھوں نے فلموں میں ایک ٹکنیک

منتاج Montage ضرور اپنی نظموں میں استعمال کی ہے۔''

اختر الایمان کی نظموں مین مکالماتی اندازِ بیان اور ڈرامائی طرز ان کے دوسرے ہم عصر شعرا میں بھی دیکھا جا سکتا ہے مگر ایک تو یہ بہ نسبت ان کے اختر الایمان، کے یہاں زیادہ ہے اور دوسرے یہ اس کُھردرے لیکن عام فہم زبان میں ملتا ہے جو اسے تخلیقی ہوتے ہوئے بھی فطری بنا دیتا ہے۔ یہ مکالماتی انداز اں کے یہاں جذبے کی شدت کو بھی بڑھاتا ہے اور جمالیاتی حُسن کو بھی ابھارتا ہے۔ اختر الایمان ایک عام فہم لہجے میں اپنی نظم شروع کرتے ہیں مگر جوں جوں نظم آگے بڑھتی ہے لگتا ہے کہانی سُلجھنے کے بجائے الجھ جاتی ہے اور آخر پر ایک ڈرامائی کیفیت اختیار کر کے پڑھنے والے کو چونکا دیتی ہے۔ ان کا کمال یہ بھی ہے کہ سخت سے سخت بات بھی اس طرح کہہ جاتے ہیں کہ غیر محسوس طور پر متاثر کر دیتی ہے۔ مثال کے طور پر ان کی ایک نظم 'پکنک' پیش کیا جا سکتا ہے جو فرقہ وارانہ فسادات کے موضوع پر ہے۔ نظم کی شروع میں موسم کا ذکر ہے جس سے دل میں یہ اُمنگ پیدا ہو جاتی ہے کہ قدرت کی کارسازیوں میں کھو جائیں، نظاروں کا لطف اٹھائیں اور کچھ دیر کے لیے اپنے غم بھول جائیں۔

ا۔ بیدار بخت۔ اختر الایمان۔ شاعری، زندگی، شاعری۔ بحوالہ رسالہ شب خون شمارہ 254

سماں بہانا تھا، ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں سے
بدن کو تازگی ملتی تھی، روح میں جیسے
اضافہ ہوتا سا محسوس ہو رہا تھا مجھے
خفا میں اڑتے ہوئے، مست ابر کے ٹکڑے
یہ لگ رہا تھا بہاروں کے ہیں فرستادے
خیال آیا کہ موسم کا لطف لیں سب دوست

پھر شہر کی مصنوعی زندگی کی طرف متوجہ ہوتا ہے کہ یہاں کی زندگی بہت ہی بھیڑ بھاو والی زندگی ہے۔ آدمی کے مرنے کی وصعت نہیں۔ انسان شہروں کی زندگی جی کر مرتا ہے، جیتا ہے اور مر مر کر جیتا ہے۔ شہر کا ذکر کرتے ہوئے شہر کے آگے عظیم لفظ جوڑ کر اس پر طنز کیا گیا ہے۔ یہاں فقروں کا مکالماتی انداز ایک ڈرامائی صورت اختیار کر لیتا ہے جس سے پڑھنے والے کی دلچسپی ایک دم بڑھ جاتی ہے۔ اور شاعر اپنی با کہنے میں کامیابی حاصل کر لیتا ہے۔ پکنک کے پس منظر میں شاعر نے فرقہ ورانہ فسادات کا ذکر چھیڑ کر پڑوسی کی موت پر اس قدر افسوس کیا ہے کہ قاری کی

حالت لمحہ بھر کے لیے غیر ہو جاتی ہے۔

اختر الایمان کی شاعری میں طنزیہ لہجہ بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ یہ لہجہ کہیں دھیما، کہیں بلند اور شدید بن کر سماج اور معاشر کے گھتپاں پیش کرنے اور رستے ہوئے ناسوروں کو کرد ینے کے سلسلے میں موثر معلوم ہوتا ہے۔ عام طور پر اس قسم کا اسلوب اور لہجہ اس وقت ہمیشہ موثر ثابت ہوتا ہے جو بلواسط طرزِ اظہار سے زبان اپنی طاقت کھو جاتی ہے اختر الایمان کے زمانے مین لکھنے والوں کو جو دو بڑی تحریکیں یا دو بڑے گروہ تھے، ان میں ایک جماعت اپنا شخصی یا اندرونی کرب لیے بھیٹی تھی اور دوسری جاعت بالواسطہ آنکھوں دیکھی واڑات اور حادثات کا رونا رو رہی تھی۔ اختر الایمان نے بظاہر انا سے اپنی کوئی وابستگی نہیں ٹھہرائی ہے مگر ان کی شاعری کا مطالعہ کرنے سے پتہ ملتا ہے کہ لاشعوری طور ان پر بھی اس کا اثر دیکھا جا سکتا ہے۔ لیکن ان کا طنو اور اسلوب ہی ایسا ہے کہ جس میں کسی بھی جماعت کی رہنمائی یا پاسداری کے نقوش واضح نہیں ہیں۔ انھوں نے جو دیکھا، اسے اپنی تخلیقی شخصیت میں جذب کیا ہے، اس کا اظہار فوراً نہیں کیا بلکہ وہ واقعات اور تجربات بہت مدت تک لاشعور کے نہاں خانے میں پلتے رہے اور جب ان کی تپش اور شدت کم ہو گئی تب ایک، آمیزے کی صورت میں انھیں قاری کے سامنے رکھا۔

اختر الایمان کی شاعری میں طنزیہ لہجہ رفتہ رفتہ کے تخلیقی سفر کا امتیازی نشان بن گیا۔ ان کے تقریباً ہر شعری مجموعے میں اس طرح کا اسلوب اور انداز ملتا ہے۔ اس حوالے سے ان کے مجموعہ کلام، ''یادیں'' کی بھی اہمیت ہے۔ مجموعے کی بیشتر نظموں میں کسی جگہ زبان کا کُھردرا پن، کہیں ڈرامائیت، کہیں مکالماتی رنگ کہیں حکایتی انداز بیان اور کہیں خود کلامی کا اثر غالب ے۔ جہاں شاعر نے سچ اور جھوٹ، بچپن اور جوانی اور آج اور کل کے مابین فرق کو ظاہر کیا ہے لیکن اس سلسلے میں انھوں نے طنزیہ لب ولہجہ سے بہت کام لیا ہے۔

اختر الایمان کی کئی ایک نظمیں ہیں جو طنزیہ لب ولہجہ کی عمدہ مثالیں ہیں۔ اس ضمن میں ان کی نظمیں میرا نا' میر ناصر حُسین کی حامل ہیں۔ ان کی اکثر نظموں میں طنز کا تیکھا پن موجود ہے۔ یہ تیکھا پن تجربے میں جذب ہو کر سُیی پیدا کرتا ہے۔ ان کی نظموں میں طنز کی کاٹ بہت تیز ہے۔ لہجے میں جو تلخی ہے اس سے شاعر کے باطنی اضطراب کی پہچان ہوتی ہے۔ بہر کیف اختر الایمان کی نظموں کا حکایتی اندازِ بیان ہو، ماضی کی بازگشت ہو، ڈرامائیت ہو، مکالماتی انداز بیان ہو یا طنزیہ لہجہ ہو، ان تمام اوصاف اور امتیازات کی وجہ سے اختر الایمان کی شاعری دور سے پہچانی جاتی

ہے۔جیسا کہ بتایا جا چکا ہے کہ یہ امتیازات دوسرے اور خاص کر ان کے معاصرین کی شاعری مین بھی دیکھنے کو ملتے ہیں مگر اختر الایمان کے یہاں یہ امتیازات ان کی پوری شاعری میں ایک گلدستے کے مترادف ہو گئے ہیں اور جس کی خوشبو بڑی دیر پا ثابت ہوسکتی ہے۔اختر الایمان کو زندہ رکھنے کے لیے کہ امتیازات ان کے لیے آکسیجن کا کام دیں گے اور ان کو حیات جاویداں بخشیں گے۔

☆☆☆

Shaukat Hayat ki Afsana nigari by Mubeena Bee (Research Scholar, Dept. of Urdu, Mohanlal Sukhadia University,Udaipur
مبینہ بی (ریسرچ اسکالر، شعبہء اردو موہن لال سکھند یا یونیورسٹی، اودے پور)

شوکت حیات کی افسانہ نگاری

دہائی کے بعد ابھرنے والی افسانہ نگاروں کی نئی نسل میں ایک اہم نام شوکت حیات کا ہے ۔شوکت حیات کی پیدائش یکم دسمبر ۱۹۵۰ء میں پٹنہ بہار میں ایک زمیندار گھرانے میں ہوئی۔گھر کے علمی ماحول میں انہوں نے پرورش پائی ان کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہی ہوئی۔ والد محفوظ الحق انسپکٹر تھے اور سروس کے دوران مختلف مقامات پر ان کے تبادلے ہوتے رہے جس کی وجہ سے شوکت حیات نے مختلف اسکولوں سے اپنی اسکولی تعلیم مکمل کی ۔ ۱۹۶۷ء میں انہوں نے میٹرک کا امتحان پاس کیا اور پھر سائنس کالج سے انٹر کرنے کے بعد میڈیکل کالج پٹنہ میں داخلہ لیا مگر ان کے طالب علمی کے زمانے میں ہی ان کا رجحان مارکسوادی اور نکسل تحریک کی طرف ہو گیا اور وہ سرمایہ دارانہ جبر واستحصال اور غیر منصفانہ نظام کے خلاف کھل کر احتجاج کرنے لگے۔جس کی وجہ سے وہ اپنی میڈیکل کی تعلیم مکمل نہ کر سکے۔

اردو زبان وادب سے انہیں بچپن سے ہی رغبت تھی ۔ یہی سبب ہے کہ انہوں نے ۲۰۰۷ء میں اردو ادب سے ایم کیا اور امتیازی نمبرات سے کامیابی حاصل کر کے گولڈ میڈل حاصل کیا اور پھر یو جی سی نیٹ کا امتحان میں بھی کامیابی حاصل کی۔اردو ادب سے دلچسپی انہیں ان کے والد محفوظ الحق کی لائبریری سے مستفیض ہوتے ہوئے طالب علمی کے دور میں ہی ہوئی اور لکھنے کا رجحان تب بنا جب پٹنہ سے دلی کے سفر کے دوران ان کے والد نے انہیں سفر کے دوران پیش آنے والے حالات اور واقعات تحریر کرنے کو کہا۔ اپنے ادبی سفر کا آغاز کرتے ہوئے انہوں نے بچوں کے لئے چند کہانیاں لکھیں اور پھر افسانہ نگاری کی طرف متوجہ ہوئے ان کا پہلا افسانہ ''بکسوں میں دبا آدمی'' ۱۹۷۰ء میں 'کتاب گھر' لکھنؤ میں شائع ہوا مگر انہیں شہرت اپنے افسانے ''بانگ'' سے حاصل ہوئی۔ جو ۱۹۷۵ء میں 'تناظر' دہلی سے شائع ہوا۔ یہ شوکت حیات کا معروف افسانہ ہے جس میں فاشزم اور

ایمرجنسی کے خلاف احتجاج کیا گیا ہے۔ یہ ایک علامتی کہانی ہے۔ دراصل جس دور میں شوکت حیات نے افسانہ نگاری کا آغاز کیا وہ علامتی اور تجریدی افسانوں کا دور تھا اسی لئے ان کے کئی افسانوں میں علامتی رنگ موجود ہے۔لیکن اس دور میں اردو افسانے سے کہانی پن غالب تھا۔سماج سے ادب کا رشتہ منقطع ہو گیا تھا مگر شوکت حیات نے بہ حیثیت تخلیق کار اپنی ذمہ داریوں کو سمجھا اور سماجی حقائق سے کہانی کا رشتہ جوڑا اور اپنی کہانیوں میں سماج کی حقیقی تصویری جھلکیوں کو پیش کیا۔اور اپنے افسانوں میں علامتوں کے پردے میں ہر ظلم وزیادتی جبر و ناانصافی کے خلاف احتجاج کی آواز بلند کی۔

افسانہ بانگ میں ایک پالٹری فارم کے مالک مرغوں کے بانگ نہ دینے کے سبب انہیں ذبح کر دیتے ہیں کیونکہ مرغوں کے بانگ نہ دینے سے انہیں صبح اٹھنے میں تاخیر ہوئی اور وہ غسل آفتاب نہیں لے سکے جو کہ انسان کی صحت کے لئے ضروری ہے۔ دھیرے دھیرے پالٹری فارم کے مالک محسوس کرتے ہیں کہ بڑی چونچ والے مرغوں کی تعداد کم ہوتی جارہی ہے۔کوئی بڑی چونچ والے مرغ غائب کررہا ہے۔ پہلا شبہ پالٹری فارم کے ملازمین پر ہوا ان سے مار پیٹ کی گئی اور پالٹری فارم سے نکال دیا گیا ان کی جگہ نئے ملازمین بحال کر لیے گئے مگر بڑی چونچ والے مرغوں کی تعداد کم ہونا بدستور جاری رہا۔ نئے مرغ بھی خریدے گئے۔ مرغے اور مرغیوں کو رنگ کی بنیاد پر پالٹری فارم میں الگ الگ رکھا جاتا تھا مگر اس کے باوجود ان کے میل سے ایک بڑی چونچ والے مرغوں کی ایک نئی نسل ابھر آئی جو بہت طاقت ور تھی ان کی چونچ اتنی طاقت ور تھی کہ وہ اسے انسانوں کی گردنوں میں پیوست کر سکتے تھے اور ایک دن اس نئی نسل کے بڑی چونچ والے مرغوں نے پالٹری فارم کے مالکوں کو چونچ مار مار کر پالٹری فارم سے باہر دھکیل دیا۔پیش ہے ایک اقتباس :

''مرغوں نے صدیوں کے بعد پولٹری فارم کے مختلف خانوں میں رنگوں کی بنیاد پر اپنے جھنڈ کو بٹتے دیکھ کر اور بانگ کی آڑ میں اپنے قتل پر چونچ اور پنجوں سے ان خانوں کو توڑنا شروع کر دیا تھا۔ دن رات آزادانہ آوارہ گردی کرنا چاہتے تھے، جب کہ ان پر پابندی تھی کہ تمام مرغ صرف اپنے رنگ کی مرغیوں کے ساتھ ہی اختلاط کر سکتے ہیں.....وہ جانتے تھے کہ رنگ کا بکھراؤ ہو گیا تو ایک دھماکہ پیدا ہوگا اور پولٹری فارم کی جالیاں لرز جائیں گی۔

انہیں زبردستی پولٹری فارم کے خانہ بند ڈربوں میں بند کر دیا گیا تو جیسے جیسے ان کی چونچیں سخت ہوتی گئیں، انہوں نے بانگ دینا چھوڑ کر جالیوں سے لگی زمین کھودنا شروع کر دیا اس طرح مرغ یہ بھی چاہتے تھے کہ.....رنگوں کی تمام پابندیوں سے دور ایسے چتکبرے چوزوں کی تخلیق کریں

جنہوں نے کبھی ڈر بہ نہ دیکھا ہو اور جو تمام ڈر بوں کو اپنے مضبوط جنگلی پنجوں اور چونچ سے مسمار کر سکتے ہوں۔ تمام مرغ بانگ کے بہانے اپنے قتل پر اس حد تک انتقام کی آگ میں جلنے لگے تھے کہ یوں بھی ان کے رنگ تبدیل ہو رہے تھے۔''

(افسانہ بانگ، مشمولہ مجموعہ گنبد کے کبوتر از شوکت حیات، ص ۲۱۹)

افسانے میں بڑی چونچ والے مرغ ان لوگوں کی علامت ہے۔ جن میں بغاوت اور انقلاب کا جذبہ بیدار ہو چکا ہے اور وہ جبر و استحصال کرنے والی تمام قوتوں کے خلاف احتجاج کرنے اور اپنے اوپر کیے گئے مظالم کا انتقام لینے کے لئے تیار ہیں۔ افسانے میں شوکت حیات کی انقلابی ذہنیت نے ظلم و جبر کے خلاف علامتی پیرائے میں صدائے احتجاج بلند کی ہے اور فکر و فن کے اعتبار سے بھی یہ ایک کامیاب افسانہ ہے۔ شوکت حیات نے معاشرے کے تلخ حقائق کا بیان اپنے افسانوں میں علامتی پیرائے میں بڑی فنکاری سے کیا ہے۔

''کوبڑ'' شوکت حیات کا ایک بہترین افسانہ ہے۔ یہ دو بھائیوں کی کہانی ہے۔ باپ کے مرنے کے بعد بڑا بھائی مخلص رہتا ہے اور پورے خاندان کی ذمہ داریاں اٹھاتا ہے۔ ذمہ داریوں کا بوجھ اور مفلسی کے مشترکہ اثرات سے جوانی میں ہی بڑھاپا اس کی زندگی میں دستک دینے لگتا ہے چھوٹے بھائی کی طبیعت میں لاپرواہی ہے کسی طرح امریکا تک پہنچ جاتا ہے آمدنی بھی اچھی خاصی ہے اور وقت وقت پر ہندوستان بھی آتا رہتا ہے مگر گھر کی معاشی بدحالی اور ذمہ داریوں سے اس کا قطعاً واسطہ نہیں۔ دونوں بھائیوں میں چند سالہ فرق ہونے کے باوجود بڑا بھائی بوڑھا نظر آتا ہے۔ دونوں بھائیوں میں معاشی تفریق ہے، بڑے بھائی کی پیٹھ پر مفلسی کے بوجھ سے جوانی میں ہی کوبڑ ابھر آیا ہے۔ ہندوستان سے جاتے وقت گلے ملتے ہوئے چھوٹے بھائی کا ہاتھ اس کو بڑ سے مس ہو جاتا ہے اور وہ خوف زدہ ہو کر پیچھے ہٹ جاتا ہے۔ متعلقہ منظر دیکھئے :

''بھیا تم اپنی صحت کا خیال نہیں رکھتے.....کیسی صحت ہوگئی ہے تمہاری.....چند سال بڑے ہو.....لیکن دیکھنے میں باپ لگتے ہو۔''

سب چلتا ہے بھائی اگلی بار جب تم آؤ گے تو میں تمہارا دادا لگوں گا اور اس سے اگلی بار شاید میں.....وہ خود کلامی کرتا ہے۔

''بھیا اب رخصت کی گھڑی ہے آؤ.....ہم لوگ گلے مل لیں.....اب نہ معلوم کب ملنا نصیب ہو۔''

اس کے بھائی نے دھیرے سے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ دونوں بھائی ایک دوسرے کے گلے لگ گئے .....دونوں کی آنکھوں میں زاروقطار آنسو رواں تھے.....اچانک چھوٹا بھائی چیخ مار کر الگ ہو گیا۔

''بھیا.....تمہاری پیٹھ پر یہ کیسا ابھار ہے.....مکروہ خبیث کے سر جیسا۔

''بھیا یہ کیسا آسیب سوار ہے تم پر.....تم نے آج تک نہیں بتایا۔

(افسانہ 'کوبڑ' مشمولہ مجموعہ گنبد کے کبوتر از شوکت حیات، ص ۵۰۔۵۱)

یہاں دونوں بھائیوں میں ذہنی اور معاشی تفریق ہے۔ چھوٹے بھائی کے معاشی حالات بہتر ہیں اور بڑے بھائی کے بدتر۔ چھوٹے بھائی کی ذہنیت زمانے سے مناسبت رکھتی ہے اور بڑا بھائی بہت معصوم اور سیدھا سادہ نظر آتا ہے۔ معاشی نابرابری کے موضوع پر تحریر کردہ شوکت حیات کا بہترین افسانہ ہے۔ افسانے میں کوبڑ معاشی بدحالی کا استعارہ ہے۔

افسانہ ''اپنا گوشت'' میں ٹوٹتے بکھرتے رشتوں کے المیے کو موضوع بنایا گیا ہے۔ افسانے میں بڑے ابو جو کہ ایک سرسبز وشاداب درخت کی طرح تھے جن کے سائے میں سب نے پرورش پائی مگر جب یہ سرسبز وشاداب درخت خزاں کی نذر ہوا تو اس کے سب اپنوں نے اس سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ بڑے ابو نے ہی والد کے انتقال کے بعد سب بھائی بہنوں کی پرورش کی اور عہد کیا کہ جب تک سب بھائی بہنوں کی ذمہ داریاں پوری نہیں کر لیتے وہ شادی نہیں کریں گے۔ آہستہ آہستہ سب بھائی بہنوں کے گھر بس گئے۔ بڑے ابو کی عمر کا طویل حصہ گھر اور گھر کے تمام افراد کی ذمہ داریاں پوری کرتے ہوئے گزر گیا تھا اپنی کبرسنی کو مدنظر رکھتے ہوئے انہوں نے شادی نہ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ بھائیوں کے بچوں کے ساتھ وقت گزارتے ان کے لئے ہاتھی گھوڑا سب بن جاتے۔ شادی شدہ نہ ہونے کو جواز بنا کر گھر اور جائیداد میں بھائی بہنوں نے حصہ بھی نہ دیا اور نہ ہی بڑے ابو نے مانگا مگر اب ان کی ہر چھوٹی بڑی بات سب کو بری لگنے لگی۔ ان کو گھر میں بے کار سمجھا جانے لگا۔ ان کی قربانیوں کو بھلا کر انہیں ذلیل کیا جانے لگا۔ مجبوراً انہوں نے گھر چھوڑ دیا مگر کسی نے ان کی خیر خبر نہ لی۔ ایک دن وہ انتہائی کسمپرسی کی حالت میں اس دار فانی سے کوچ کر گئے مگر تب بھی گھر کے کسی فرد کو کوئی فرق نہیں پڑا اور نہ ہی کوئی ان کے جنازے میں شریک ہوا بلکہ بڑے ابو کی موت کی خبر سن لینے کے باوجود ان کے معمولات زندگی میں کوئی فرق نہیں آیا۔ چھوٹے بھائی آرام سے بیٹھے مرغ کی ٹانگ چباتے ہوئے اپنے بیٹے سے کھانا کھانے کے لئے اسرار کرتے ہیں۔ مگر ان

کا بیٹا جس کا بچپن بڑے ابو کی شفقت کے سایہ میں گزرا تھا وہ کھانا نہیں کھا پاتا۔ کھانا کھاتے ہوئے اسے یوں محسوس ہوتا ہے گویا وہ اپنا ہی گوشت کھا رہا ہو۔

رشتوں کے بکھراؤ کا کرب، احسان فراموشی اور خودغرضی، حقیقی رشتوں میں شفقت واخوت کا تنزل افسانے کا موضوع ہے جو کہ دور حاضر میں ایک اہم مسئلہ ہے۔ افسانے نگار نے کہانی میں ایسے خودغرض رشتوں اور معاشرے کی بے حسی پر طنز کیا ہے۔ اس مسئلے کو افسانہ نگار نے اپنے ایک اور افسانے ''رحمت صاحب'' میں بھی پیش کیا ہے۔ رحمت صاحب افسانے کا مرکزی کردار ہیں جو ریٹائرمنٹ کے بعد اپنی زندگی کا عذاب ڈھو رہے ہیں۔ کیونکہ ریٹائرمنٹ کے بعد وہ بے کار سمجھ لیے جاتے ہیں، پیسے اور جائیداد پر بہوؤں اور بیٹوں کا اختیار ہو جانے کے بعد انہیں بوجھ سمجھا جاتا ہے ان کے لئے ایک سال میں چاروں بیٹوں کے یہاں تین تین مہینے کے قیام کا بٹوارہ ہوتا ہے مگر کوئی بیٹا انہیں آگے بڑھ کر لینے نہیں آتا انہیں خود ہی ایک بیٹے کے یہاں سے دوسرے کے یہاں جانا پڑتا ہے۔ کوئی بیٹا انہیں اپنے ساتھ نہیں رکھنا چاہتا۔ بہو بیٹے انہیں ذلیل کرتے ہیں، ان کے ساتھ لعن طعن کرتے ہیں، اپنے ہی بچوں سے ملے اس دھوکے اور ذلت سے وہ ٹوٹ جاتے ہیں اور ان کی زندگی انہیں عذاب لگنے لگتی ہے۔

بزرگوں کی ناقدری، دولت کی بڑھتی ہوس اور رشتوں کے بکھراؤ کا احساس افسانے میں ہوتا ہے۔ عہد حاضر کا یہ ایک اہم مسئلہ ہے جسے بڑے عمدہ اسلوب میں افسانہ نگار نے پیش کیا ہے۔ معاشی بدحالی اور بے روزگاری کے پس منظر میں لکھا گیا شوکت حیات کا افسانہ مسٹر گلیڈ ایک کامیاب افسانہ ہے۔ افسانے میں غربت سے پریشان ایک ایسے شخص نہال چند کی کہانی ہے۔ تنگ حالی کے سبب اس کی بیوی بچے اسے چھوڑ کر چلے جاتے ہیں وہ تنہا رہ جاتا ہے کوئی اس کا رفیق حیات نہیں رہتا۔ تنہائی کے کرب میں مبتلا ہو کر وہ اپنا ذہنی توازن کھو دیتا ہے اور اس پاگل پن میں اپنا نام حلیہ اور اپنی زبان تک بدل دیتا ہے۔ مسٹر نہال سے وہ اب مسٹر گلیڈ ہو جاتا ہے اور حلیہ اور زبان میں بھی اپنے نام کی مناسبت سے تبدیلی لانے کی کوشش کرتا ہے۔

افسانہ میں مسٹر گلیڈ اپنی بے روزگاری، معاشی بدحالی اور غربت کے باعث پریشان ہے اور اسی وجہ سے زندگی میں تنہا بھی ہے اور یہ تنہائی اس کے لئے اتنی کرب ناک ثابت ہوتی ہے کہ وہ اپنا ذہنی توازن کھو دیتا ہے اور اپنی ذات سے متعلق تمام چیزیں گویا اپنا نام حلیہ زبان بدل دیتا ہے۔ افسانہ پڑھنے میں بالکل حقیقی معلوم ہوتا ہے سادے اسلوب میں لکھا گیا ہے، مگر یہ افسانہ اپنے آپ

میں ایک گہری معنویت رکھتا ہے۔افسانے میں مسٹرنہال جب اپنے سے وابستہ تمام چیزیں بدلتا ہے تو یہاں وہ سب کچھ بدلنا چاہتا ہے جس کے سبب اس کی زندگی کرب ناک بنی ہوئی ہے وہ اس نظام کو بدلنا چاہتا ہے، جہاں سماج مختلف طبقات میں تقسیم ہے۔معاشی نابرابری اس خلیج کو مٹا کر وہ معاشرے کی نابرابری کو ختم کرنا چاہتا ہے مگر چونکہ یہ سب اس کے دست قدرت سے باہر ہے اس لئے وہ اپنے اختیارات میں آنے والی تمام چیزیں جو اس سے منسلک ہیں بدل دیتا ہے۔افسانے میں مسٹرنہال اپنا نام بدل کر مسٹر گلیڈ ہوجاتا ہے گلیڈ نہال کا مترادف ہے جس کے معنی خوشی کے ہیں۔گلیڈ ایک انگریزی نام ہے اور نہال ہندی نام ہے۔افسانے میں نہال اپنا نام بدل کر گلیڈ رکھ لیتا ہے اور نام کی مناسبت سے اپنا حلیہ اور اپنی زبان بھی بدلتا ہے۔یہاں ایک طنز بھی محسوس ہوتا ہے کیونکہ یہاں نام اور زبان سے مراد صرف نام اور زبان نہیں بلکہ پوری تہذیب ہے۔یہاں مسٹر گلیڈ کی مشرقی تہذیب سے بیزاری اور مغربی تہذیب کی طرف رغبت نظر آتی ہے۔کیونکہ وہ مغربی تہذیب کو ایک ترقی یافتہ تہذیب خیال کرتا ہے اور اسی لئے اس تہذیب کا حصہ بننے کی کوشش کرتا ہے۔افسانے میں معاشرے کی حقیقی تصویر نظر آتی ہے۔افسانے کے متن میں گہری معنویت پنہاں ہے۔

'میت' شوکت حیات کے لازوال افسانوں میں سے ایک ہے یہ افسانہ عورت کی بے بسی اس کی مجبوری کمزوری اور صدیوں سے ہو رہے اس کے استحصال کی کہانی ہے جو اس کی موت کے ساتھ ہی ختم ہوتا ہے مگر یہاں افسانہ نگار کا کمال یہ ہے کہ جس نقطہ پر کہانی ختم ہوجاتی ہے، وہاں سے کہانی کا آغاز کیا ہے۔اس نقطے سے افسانے میں مصنف خود کہانی کا ایک کردار ہے جو آمیر درانی کا دوست ہے جس کی بیوی کی ہارٹ اٹیک سے یکا یک موت ہوجاتی ہے۔آمیز کے اطلاع دینے پر وہ اس کے گھر پہنچتا ہے۔وہ مرحومہ کو بھابھی کہتا تھا لیکن گھر پہنچنے پر امیر کے رویے سے وہ متعجب ہوتا ہے کیونکہ امیر اپنی بیوی کی یکا یک موت پر غم وافسوس ظاہر کرنے کے بجائے اس موقع پر اس کے گھر آئے ہوئے شہر کے معزز لوگوں کے ازدحام، ٹی وی چینلس والوں، اخبار رپورٹرس وغیرہ کے بارے میں بات کرتا ہے۔اسے اپنی بیوی کی موت کا کوئی غم نہیں ہوتا۔محلے میں قریب ہی قبرستان ہونے کے باوجود تدفین کے لئے ہوائی اڈے کے دور دراز قبرستان میں انتظام کیا گیا تاکہ وی آئی پی لوگوں کے آنے میں دقت نہ ہو اور گھر سے ہوائی اڈے تک گاڑیوں کا طویل قافلہ رہے۔آنے والوں کے سامنے موقع کی مناسبت سے برتاؤ کرتا مگر اس کے اندرون میں غم کی کوئی کیفیت نظر نہیں آئی۔ امیر افسانے میں کچھ خاص لوگوں کا انتظار کر رہا ہے اور یہ انتظار طویل ہوتا جاتا ہے اور اس انتظار کے

ساتھ میت کا تربت کے لئے انتظار بھی طویل ہوتا جاتا ہے۔

افسانے کا عنوان 'میت' ہے یہ میت اس مظلوم عورت کی ہے جو اپنے موقع پرست شوہر کے ظلم وزیادتیوں کی شکار ہوکر اپنی زندگی کی شادمانیوں سے محروم ہوئی اور اس بے رحم شخص کے مظالم سہتے سہتے تھک کر موت کی آغوش میں سوگئی تھی۔ یہ میت امیر درانی کی بیوی کی ہے۔ جو ایک سیاسی پارٹی کا بااقتدار رکن ہے جس نے اپنی بیوی کو زینہ کی طرح استعمال کیا اور اسے دوسروں کی تفریح کا ذریعہ بنادیا۔ اور اب اس کی موت کے بعد اس کی میت سے بھی کوئی نہ کوئی فائدہ اٹھانا چاہتا ہے۔ سب لوگ آچکے ہیں میت کو غسل دیا جاچکا ہے۔ جنازہ تیار ہے مگر امیر درانی کو کسی کا انتظار ہے۔ متعلقہ منظر دیکھئے :

''بوجھل قدموں سے مولانا دھیرے دھیرے چلتے ہوئے امیر درانی کے پاس آئے۔

''جنازے کو رخصت کی اجازت دیجئے حضور.....ابھی کئی مراحل طے کرنے ہیں.....تاخیر ہوتی چلی جارہی ہے۔''

امیر نے بے چارگی سے ایک نظر مولانا اور ایک نظر دالان میں رکھی ہوئی اپنی بیوی کی میت کی طرف دیکھا.....ایک لمبی ٹھنڈی سانس چھوڑی۔

''مولانا صاحب کچھ انتظام کرتا ہوں.....تھوڑا صبر سے کام لیں۔

میت تربت کی منتظر تھی۔

آمیر کو جانے کن خاص لوگوں کا انتظار تھا۔

اس دوست نے محسوس کیا کہ آمیر کی نظروں میں کوئی بیش قیمت سامان سفید کپڑے میں ڈھک کر رکھ دیا گیا تھا۔ چیز چلی گئی تو چانس ہاتھ سے نکل جائے گا۔

(افسانہ 'میت' مشمولہ مجموعہ گنبد کے کبوتر از شوکت حیات، ص ۷۰۔۷۱)

افسانے میں ابتدا سے آخر تک کسی کا انتظار کیا جارہا ہے مگر کس کا؟ یہ ایک سوال ہے، یہ سوال وہاں موجود تمام لوگوں کے ذہن میں ہے اور قارئین کے بھی۔ میت تربت کی منتظر ہے انتظار کرتے کرتے صبح سے شام ہوجاتی ہے۔ جان پہچان والے عزیز اور رشتے دار سبھی لوگ آچکے ہیں۔ مگر انتظار جاری رہتا ہے۔ افسانے میں آمیر درانی اپنی بیوی کی موت کے المناک موقع کو کسی سیاسی امور کے لئے استعمال کرتا ہے۔ وہ افسانے میں شروع سے آخر تک کسی کا انتظار کرتا نظر آتا ہے مگر کس کا؟ یہ افسانے میں واضح نہیں ہو پاتا۔ افسانے میں امیر درانی اپنی بیوی کی موت سے لوگوں کی

ہمدردی اور حمایت حاصل کر کے شہر کے معزز اور وی آئی پی لوگوں سے اپنے اچھے مراسم بنانا چاہتا ہے ۔اور ساتھ ہی اس المناک موقع کے ذریعے کسی خاص وی آئی پی ہستی سے رفاقت پیدا کرنا چاہتا ہے جس کا وہ افسانے میں انتظار کر رہا ہے۔سیاست اور سیاسی اراکین کی زندگی کی چمک چمک کے پیچھے زندگہ کا بدنما چہرہ ورشتوں میں محبت کے زوال، عورت کا استحصال ،موقع پرستی اور خود غرضی جیسے موضوعات کو افسانہ نگار نے بڑی مہارت سے عمدہ اسلوب میں افسانے میں پیش کیا ہے۔

افسانہ چیخیں دور حاضر میں اسکولوں میں تعلیمی نظام، انگریزی اسکول میں تعلیم حاصل کرنے کے لئے بچوں اور والدین کی جدوجہد کو موضوع بنایا گیا ہے۔افسانے میں ایک انگریزی میڈیم کے نامور اسکول میں داخلہ ٹیسٹ کا رزلٹ آیا ہے ۔ٹیسٹ میں کامیاب ہونے والے بچوں کے نام کی فہرست دیوار پر چسپاں کر دی گئی ہے۔لوگ یہاں آ کر اپنے بچوں کے نام اس فہرست میں دیکھتے ہیں جن کے بچے کامیاب نہیں ہوئے ہیں۔ان کے والدین خوش نظر نہیں آتے ہیں مگر جن کے بچے اس امتحان میں کامیاب ہوئے ہیں ان کے چہرے پر بھی کوئی خاص خوشی نظر نہیں آتی ۔اسی درمیان ایک چیخ آتی ہے لوگ اس کی طرف متوجہ ہوتے ہیں مگر پتہ نہیں چلتا ہے کہ چیخ کہاں سے آئی ہے ۔تبھی وہاں ایک بوڑھا شخص اپنے بیٹے کو لے کر آتا ہے مگر فہرست کے اوپر چسپاں ہونے کی وجہ سے وہ اپنے بچے کا نام نہیں دیکھ پاتا۔ایک دوسرا شخص دیکھتا ہے تو کہتا ہے شاید اس میں تمہارے بچے کا نام نہیں۔ وہ بچے کو اٹھا کر کہتا ہے تو خود اپنا نام فہرست میں دیکھ لے ۔مگر تھوڑی دیر میں اس کا بچہ اسے بہت بھاری معلوم ہوتا ہے اور وہ اپنے بچے کو نیچے اتارتا ہے بچہ گر جاتا ہے۔فہرست میں بچے کا نام نہ ہونے سے وہ پریشان ہوتا ہے اور بچے کو ایک طمانچہ لگاتا ہے۔ایک آدمی درمیان آ جاتا ہے اور کہتا ہے آپ بچے کو خود پڑھاؤ۔ان اسکولوں میں کچھ نہیں رکھا۔بوڑھا اپنے بچے کے لئے پریشان ہے۔ بچے سے اتنی محنت کروانے کے باوجود اس کا داخلہ نہیں ہو پایا تبھی وہ دیکھتا ہے کہ اس کے بچے کا قد اس سے بھی بڑا ہو گیا ہے وہ چلانے لگتا ہے کہ میرا بیٹا جوان ہونے سے پہلے ہی بوڑھا ہو گیا۔لوگ اسے سمجھاتے ہیں کہ اس کا بچہ پہلی حالت میں ہی اس کے پاس موجود ہے ۔اور پھر متواتر چیخوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے جو اسکول کے احاطے میں ہر تھوڑے تھوڑے وقفہ میں پہلے سے سنائی دے رہی تھی مگر اس بار لوگ ان چیخوں کو سن کر اپنے اندرون کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔

افسانہ 'چیخیں' دور حاضر میں ایک اہم مسئلہ کو پیش کرتا ہے۔بچوں کو انگلش میڈیم اسکولوں میں پڑھانا آج اسٹیٹس سیمبل بن چکا ہے ۔اور ان اسکولوں کا دباؤ بچوں اور ان کے والدین پر

بڑھتا جارہا ہے اور اس دباؤ سے ان کا باطن چیخ رہا ہے اور یہی چیخیں افسانے میں سنائی دے رہی ہیں۔

'گنبد کے کبوتر' شوکت حیات کا کامیاب افسانہ ہے۔ یہ بابری مسجد کے انہدام کے موضوع پر علامتی پیرائے میں لکھا گیا بہترین افسانہ ہے۔ افسانے میں گنبد کے گر جانے کے بعد بے سہارا اور بے ٹھکانہ ہوئے کبوتروں کا غول آسمان میں اڑ رہا ہے۔ اسے سہارے کی تلاش ہے اڑتے اڑتے ان کے بازو شل ہو گئے ہیں۔ مگر اب ان کے لئے کوئی پناہ گاہ نہیں ہے۔ وہ گنبد ہی تھا جو کئی نسلوں سے ان کی پناہ گاہ تھا۔ اب وہ نہیں رہا۔ اگر وہ کسی پناہ گاہ کی تلاش میں زمین پر آتے ہیں تو کسی مذبح کے اسیر ہو جاتے ہیں یا کسی جانور کا شکار۔ پیش ہے ایک اقتباس :

''بے ٹھکانہ کبوتروں کا غول مستقل آسمان میں چکر کاٹ رہا ہے۔ اپنے مستقر کے بے دردی اور بربریت کے ساتھ مسمار کر کے غائب کر دیئے جانے کے بعد کیسی بے گھری اور بے امانی جھیل رہا ہے۔ آپ ان کبوتروں کی آنکھیں دیکھ رہے ہیں.....ان میں اترتا خون، بیچارگی اور کچھ کر گزرنے کی تڑپتی ہوئی آرزوئیں محسوس کر رہے ہیں۔.....''

(افسانہ' گنبد کے کبوتر' مجموعہ گنبد کے کبوتر از شوکت حیات، ص ۷۷)

افسانے میں گنبد جو ان کبوتروں کا ٹھکانہ تھا ان کا سہارا تھا بطور علامت پیش کیا گیا ہے۔ یہ گنبد علامت تھا ہماری تہذیب اور سنہری تاریخ کا جسے مسمار کر دیا گیا اور یہ کبوتر ان لاکھوں لوگوں کی علامت ہے جن کی تہذیب، مذہب اور تاریخ کو مسمار کر دینے کی منظم سازش کا آغاز اس گنبد کے انہدام سے کیا گیا ہے۔ افسانے کا موضوع بابری مسجد کا انہدام ہے مگر واضح طور پر کچھ نہ کہہ کر افسانہ نگار نے پورے افسانے کو علامتی پیرائے میں پیش کیا ہے۔ شوکت حیات نے زندگی کے ہر گوشے پر اپنی گہری نظر ڈالی اور زندگی کے ہر رنگ کو اپنے افسانوں میں سمویا جہاں ان کے افسانوں میں سیاسی وسماجی بصیرت ہے وہیں روح اور قلب کی گہرائیوں میں اترنے والی محبت کا احساس ''رانی باغ'' اس ضمن میں ایک بہترین افسانہ ہے۔ افسانے میں افسانہ نگار نے محبت کے اس خوبصورت احساس کو بڑی عمدگی سے پیش کیا ہے۔ یہ ایک مسلم لڑکے 'رحمت' اور ایک غیر مسلم لڑکی 'رانی' کی محبت کی کہانی ہے۔

افسانے کی ابتدا میں رحمت صاحب اپنے بیٹوں سے اپنے وطن لوٹنے کی خواہش کا اظہار کرتے ہیں۔ رحمت صاحب کی خراب صحت کو مد نظر رکھتے ہوئے بیٹے انہیں اکیلے وطن نہیں بھیجنا چاہتے کیونکہ ڈاکٹر رحمت صاحب کے لئے جواب دے چکے ہیں مگر پھر باپ کی ضد کے آگے سرخم

کر دیتے ہیں۔ دراصل رحمت صاحب کی اس ضد کے پیچھے عنفوان شباب کی وہ محبت تھی جو تصورات اور خیالات میں زندگی بھر ان کے ساتھ رہی اور اب بستر مرگ پر اس محبت کی کشش انہیں وطن کی جانب کھینچ رہی تھی۔ رحمت صاحب اور رانی دونوں بچپن کے ساتھی تھے۔ وقت گزرنے کے ساتھ دونوں نے جوانی کی دہلیز پر قدم رکھا۔ ایک دن کھیل کھیل میں دونوں ایک دوسرے کے قریب آ گئے ایک دوسرے کے لمس کو محسوس کرتے ہوئے دونوں ایک انوکھے احساس سے آشنا ہوئے تھے۔ رحمت صاحب پوری زندگی ان لمحات کے اسیر رہے۔ وطن لوٹنے پر ان کی ملاقات رانی سے ہوتی ہے اور ایک روز آزاد باغ جو رحمت صاحب کے لئے رانی باغ تھا میں ان پر اس حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے کہ وہ لمحات جو انہیں زندگی بھر اپنا اسیر بنائے رکھے ہیں رانی بھی انہیں لمحات کی قید میں گرفتار ہے۔ وہ رانی باغ میں اپنے ان خوبصورت لمحات کی یادوں میں کھوئے رہتے ہیں دونوں کی رفاقتوں کے درمیان اب کوئی رکاوٹ نہ تھی۔ رانی کی بے غرض محبت رحمت صاحب کے لئے آب حیات ثابت ہوتی ہے اور بستر مرگ پر انہیں نئی زندگی عطا کرتی ہے۔

افسانہ ''رانی باغ'' شوکت حیات کا رومانی افسانہ ہے۔ جس میں انہوں نے عشق کو تمام پابندیوں اور مذہب، ذات پات، عمر کی تمام حدود سے مبرا بتایا ہے۔ افسانہ نگار نے محبت کے پر کیف احساسات کا اظہار اس گہرائی سے کیا ہے کہ قاری اس احساس کے حصار میں محصور ہو جاتا ہے۔

شوکت حیات کے یہاں زندگی کے تمام رنگ اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ موجود ہیں بلاشبہ وہ اپنے عہد کی ایک اہم آواز ہیں انہوں نے ایسے افسانوں کی بنیاد ڈالی جو عصری اور آفاقی تقاضوں کو بیک وقت پورا کرتے ہیں اور اسی لئے انہوں نے اپنے افسانوں کو نامیاتی انامیاتی افسانے کہا ہے۔ بقول فاروق ارگلی :

''شوکت حیات کے افسانے ایسے افسانوں کی داغ بیل ڈالتے ہیں جو بیک وقت عصری اور آفاقی افسانوں کے آمیزے اور اختصاص وانفراد سے مملو ہیں۔ وقت، سماج، روایت، سیاست، نفسیات، ثقافت اور فکر کی جکڑ بندیوں کو جھیلتے ہوئے افسانوں کی تصویر کشی جس دردمندی کے ساتھ شوکت حیات کے یہاں ملتی ہے، وہ دوسروں کے یہاں نہیں۔ عصری اور آفاقی انسان کی بیچارگی، زندگی کی بے ثباتی اور ناکارگی بستی۔ موضوعات ان کے افسانوں میں نئی آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر ہوئے ہیں جنہیں سن کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے۔ ۱۹۷۰ء کے بعد اس اہم افسانہ نگار شوکت حیات نے ۱۹۸۰۔ ۱۹۹۰ء اور نئی صدی میں بھی تازہ کاری اور روانی کے ساتھ اس طرح نئے رنگ و روغن اور نئے خط

وخیال میں اپنے افسانے پیش کئے جنہیں پڑھ کر، ان کی دہائیوں کے حصار سے اٹھ کر اپنی حیثیت واہمیت کو دوچند کرانے کا احساس ملتا ہے۔ اسی لئے وہ اپنے افسانوں کو انام، انامیاتی اور جدلیاتی، حرکی، امکانی وفکری افسانے کہتے ہیں۔''

('شوکت حیات کا فن' ثالث شوکت حیات نمبر، جنوری تا جون ۲۰۲۲ء، فاروق ارگلی، ص ۲۷)

شوکت حیات کے یہاں موضوعات کا تنوع ہے۔ انہوں نے بڑی فن کاری سے سماج کے تلخ حقائق کو اپنے افسانوں میں علامتی پیرائے میں پیش کیا ہے اور زندگی کے ہر پہلو کو انہوں نے اپنی گرفت میں لینے کی سعی کی ہے۔ ان کا افسانوی مجموعہ 'گنبد کے کبوتر' کے علاوہ ان کے ۱۰۰ سے زائد افسانے مختلف رسائل اور جرائد میں شائع ہو چکے ہیں۔ گھونسلہ، فرشتے، رحمت صاحب، سانپوں سے نہ ڈرنے والا بچہ، گھڑیال، پھسینڈا، تفتیش، ڈھلان پر رکے قدم، سرخ اپارٹمنٹ وغیرہ ان کے معروف افسانے ہیں۔

☆☆☆

Nigarishat-e-Akhtar ka Usloobiyati mutalea by Dr. MD. Naim Raza

(Banka,Bihar)cell-7371818327

ڈاکٹر محمد نعیم رضا (بانکہ، بہار)

نگارشات اختر کا اسلوبیاتی مطالعہ

ادب (چاہے نظم کی شکل میں ہو یا نثر کی صورت میں) میں اسلوب کی بڑی اہمیت ہے۔ ایک ادیب یا شاعر فنکاروں کی بھیڑ میں محض اپنے نمایاں اسلوب اور منفرد طرزِ بیان سے پہچانے جاتے ہیں۔ اسلوب، ادائے خیالات اور اظہارِ جذبات کے طریقے کا نام ہے۔ اسلوب کی یہ عام فہم تعریف نظم ونثر دونوں کو حاوی ہے۔ نثر اور نظم میں بنیادی فرق یہی ہے کہ نثر میں کسی بھی مفہوم اور خیال کو نپے تلے انداز میں تسلسل کے ساتھ بحر و وزن کے التزام کے بغیر ادا کیا جاتا ہے، جب کہ نظم میں بحر واوزان کی پابندی ضروری ہے۔ نظم (شعر) میں ردیف وقافیہ کا اہتمام ہوتا ہے اور جذبات وتخیل کی ترجمانی ایک مخصوص طریقے کے مطابق کی جاتی ہے۔ مشرقی روایت کی رو سے اسلوب، ادبی اظہار کا زیور ہے جس سے کلام کے حسن وجاذبیت، کشش اور تاثیر وتاثر میں اضافہ ہوتا ہے۔ اسلوب کی حیثیت ادبی اظہار میں اضافی نہیں، بلکہ اصلی ہے جس میں تخلیقی عمل کا حصہ ناگزیر ہے۔ اسلوب ادب کا وہ دلکش پیرایہء بیان ہے جس سے زبان ادبی اظہار کا درجہ حاصل کرتی ہے۔ اسلوب فی نفسہ ادبی اظہار کے وجود سے جڑا ہوا ہے۔ کوئی خیال، کوئی مفہوم، کوئی مخصوص نظریہ یا احساس وجذبہ اسلوب کے سہارے بیان کیا جاسکتا ہے۔ ادیب وشاعر پیرایہء بیان کی اس آزادی کو شعوری یا غیر شعوری طور پر استعمال کرتا ہے۔ اس میں فنکار کے شعور ووجدان، ذاتی پسند وناپسند، صنف یا ہیئت کے تقاضوں نیز قاری کی نوعیت کے تصور کا بھی دخل ہے۔ اسلوبیاتی مطالعے میں جہاں لسانیاتی اور لفظیاتی مطالعہ کیا جاتا ہے، وہاں الفاظ وتراکیب اور مصرعوں کی بناوٹ کا صرف ونحو کے حوالے سے بھی محققانہ تجزیہ کیا جاتا ہے اور فنکار کے فکر وفن کا تعین خالص علمی، ادبی اور لسانیاتی اعتبار سے کیا جاتا ہے۔ اسلوب کی تعمیر وتشکیل میں فنکار کی شخصیت، اس کا عہد، ماحول، مقصدِ تخلیق اور مخاطب کا کچھ نہ کچھ دخل ضرور ہوتا ہے۔ لیکن تشکیلِ اسلوب کے ان عناصرِ خمسہ میں سب سے اہم رول فنکار کی شخصیت اور ادب کی غرض وغایت ادا کرتی ہے۔ شاعر وادیب کی شخصیت جتنی عظیم اور دل آویز ہوتی

ہے، اس کا اسلوب بھی اتنا ہی عظیم، پُرکشش، دل آویز اور افادی نوعیت کا ہوتا ہے۔ اسلوب میں شخصیت کا عکس صاف نظر آتا ہے۔ قارئین دور ہی سے فنکار کی شخصیت کا اندازہ اس کے اسلوب سے لگا لیتا ہے۔ اسلوب دراصل کسی بھی شاعر یا مصنف کی منفرد طرزِ تحریر کو کہتے ہیں، جس سے اس کی شخصیت اور فکر وفن کی شناخت ہوتی ہے۔ نصیر احمد خان اسلوب کی تعریف بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں "اسلوب انگریزی لفظ اسٹائل کے مترادف ہے جس سے مراد ایک ایسی طرزِ تحریر ہے جو ہر اعتبار سے منفرد ہو، جو ادیب یا شاعر کی شخصیت کی مظہر ہو اور وہ خارجی ولسانی پہلوؤں کے علاوہ فنکار کے انداز و بیان، اندازِ فکر اور اندازِ تخلیق کی نمائندگی کرے"۔

دیگر اصناف کے مقابل نعت گوئی میں اسلوب کی جدت وندرت کو برقرار رکھتے ہوئے اسے کامیابی کے ساتھ برتنا، شاعر کی قدرتِ فن اور مہارتِ سخن کی دلیل ہے۔ اسلوب کی دلکشی اور اندازِ بیان کی طرفگی حسنِ کلام میں اضافہ کرتی ہے اور اسے دوام واستحکام بخشتی ہے۔ اس لیے کلام میں اسلوب کا منفرد اور پُرکشش ہونا ضروری ہے۔ پامال مضمون اور بوسیدہ خیال محض اسلوب کی چاشنی سے حسین اور پرکشش بن جاتا ہے۔ لیکن اسلوب کی عمدگی کے چکر میں معنیٰ کا گلا گھونٹنا مناسب نہیں۔ ایک فنکار اور بالخصوص شاعر کو یہ حقیقت ہمیشہ پیشِ نظر رکھنا چاہیے کہ اس کے پیش کردہ الفاظ ومعانی عمدہ ہونے کے علاوہ بیانِ واقعہ آسان اور سہل ہو۔ تشبیہات واستعارات مانوس ہوں اور پیشکش میں عصری حسیت اور تاریخی صداقت کے ساتھ اندازِ بیان متین، سنجیدہ اور سریع الفہم ہو۔

اسلوب چوں کہ نظم ونثر دونوں میں پایا جاتا ہے اور فنکار کی شخصیت وفن کا آئینہ دار ہوتا ہے، اس لیے اس کی اولاً دو قسمیں ہیں: نثری اسلوب اور اور شعری اسلوب۔ نثری اسلوب وہ ہے جس کا تعلق بنیادی طور پر ادائے خیالات سے ہو اور شعری اسلوب وہ ہے جو اظہارِ جذبات وتخیلات کے ساتھ مخصوص ہو۔ ادائے خیال (جس کی جھلک نثری اسلوب میں پائی جاتی ہے) یہ ہے کہ فنکار (ادیب وشاعر) اپنے خیالات اور ذہنی تجربات بلاکم وکاست قاری کے ذہن تک پہنچادے اور اسی عمل کو ابلاغِ خیال کہتے ہیں جس کے لیے فنکار کو لامحالہ وہ اسلوب اختیار کرنا پڑتا ہے جو متین، سنجیدہ، سریع الفہم اور علمی واستدلالی نوعیت کا حامل ہو جس کا مطالعہ قاری کو متاثر اور ذہن وفکر کو اپیل کرے۔ اربابِ علم وادب سے یہ حقیقت مخفی نہیں کہ نثر میں وہی اسلوب قاری کو متاثر کرتا ہے جو سادہ، سلیس، عام فہم، بحر وقافیہ سے خالی اور انسانی فہم سے قریب تر ہو۔ شعر کی طرح اس میں تخیلات کی بلند پروازی اور تشبیہ واستعارہ کی گرم بازاری نہ ہو۔ اور جہاں تک شعری اسلوب کی بات ہے تو یہ نثری اسلوب

سے بالکل مختلف ہے اور یہ اختلاف ضروری بھی ہے، ورنہ نظم ونثر میں فرق وامتیاز دشوار ہوگا۔ شاعری چوں کہ جذبات وخیالات اور احساسات وتخیلات کے حسیں اور موزوں اظہار کا نام ہے، اس لیے اس کا اسلوب نثر کے اسلوب سے بالکل جدا ہے۔ نثر کی طرح ابلاغِ خیال نظم میں بھی پایا جاتا ہے، لیکن نظم میں ابلاغِ خیال کی ادائیگی کی نوعیت کچھ اور ہوتی ہے۔ شعری اسلوب میں تخیل کی کارفرمائی کے ساتھ ایک قسم کا بلیغ ابہام ہوتا ہے۔ لطیف نغمگی ہوتی ہے۔ سوز وگداز ہوتا ہے اور صفحۂ قرطاس کو خونِ جگر سے لالہ زار بنانے کا جذبہ ہوتا ہے۔ اس میں ایک ایسی ماورائی کیفیت ہوتی ہے جو سننے والوں کو مسرور بھی کرتی ہے اور مسحور بھی۔ اسلوب کی حقیقت وماہیت میں اہلِ ادب کا شدید اختلاف ہے۔ ہر ایک نے اپنے ذوق ووجدان کے مطابق اسلوب کی تعریف کی ہے۔ بعض محققینِ ادب کے مطابق اسلوب بہ ذاتِ خود انسان ہے یعنی انسانی شخصیت کا آئینہ دار ہے۔ کیوں کہ اسلوب کا معنی طور ،طریقہ اور ڈھنگ ہے اور ہر انسان کے کام کرنے کا طریقہ اور ڈھنگ مختلف ہوتا ہے۔ لہٰذا اسلوب، شخصیت کا آئینہ دار ٹھہرا۔ لیکن اسلوب کی یہ تعریف جامع نہیں، کیوں کہ ماہرینِ لسانیات نے اسلوب کی مختلف تعریفیں شخصیت کے اعتبار سے نہیں بلکہ زبان و بیان کے لحاظ سے کی ہیں اور یہی درست ہے۔ مشہور امریکی ماہرِ لسانیات چارلز ایف ہاکٹ (Charles F. Hockett) اسلوب کی تعریف بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے :

ایک ہی زبان کے دو فقرے یا جملے جو تقریباً ایک ہی معنی ومفہوم کو ادا کرتے ہوں، جب اپنی لسانی ساخت کے اعتبار سے مختلف ہوں تو کہا جائے گا کہ ان فقروں یا جملوں میں اسلوب کا فرق ہے۔ اسلوب کی حقیقت وماہیت کو سمجھنے کے لیے دو باتیں خصوصیت کے ساتھ ذہن میں رکھنا چاہیے۔ اول یہ کہ اسلوب کا تعلق زبان کے استعمال سے ہے۔ دوم یہ کہ جب تک دو متبادل ذریع؟ اظہار میں لسانی ساخت کے اعتبار سے فرق نہ پایا جائے ، اسلوب معرضِ وجود میں نہیں آسکتا۔ اس بات کو مندرجہ ذیل کی دو مثالوں سے آپ بہ خوبی سمجھ سکتے ہیں :1 پانی برس رہا ہے(2) بارش ہو رہی ہے

یہ دونوں جملے ایک ہی مفہوم کو ادا کرتے ہیں اور معنی کے اعتبار سے ان میں کوئی فرق بھی نہیں ہے، لیکن لسانی ساخت کے اعتبار سے ان میں نمایاں فرق موجود ہے۔ پہلے جملے میں پانی کا لفظ استعمال ہوا ہے، جب کہ دوسرے جملے میں بارش کا۔ قواعد کی رو سے لفظ پانی مذکر ہے اور بارش مونث۔ اسی طرح جب ہم فعل پر نظر ڈالتے ہیں تو پہلے جملے میں "برس رہا ہے" فعل مذکر ہے اور دوسرے جملے میں "برس رہی ہے" فعل مؤنث ہے۔ اس سے یہ حقیقت اجاگر ہوتی ہے کہ ان جملوں

کی لسانی ساخت مختلف ہے، اس لیے ان کے اسلوب میں بھی فرق ہے۔ لسانی ساخت کے فرق سے اسلوب میں فرق کی دوسری مثال یہ ہے :(1) زید مر گیا (2) زید کا انتقال ہو گیا (3) زید کی شمعِ حیات گل ہو گئی (4) زید کی زندگی کا آفتاب غروب ہو گیا۔ مذکورہ چاروں جملوں کا مفہوم ایک ہے یعنی زید کے انتقال کی خبر دینا، لیکن لسانی ساخت میں فرق و امتیاز کی وجہ سے ان چاروں جملوں کے اسلوب میں نمایاں فرق ہے۔ پہلے اور دوسرے جملے کا اسلوب بالکل سادہ، عام فہم اور بے تکلفانہ ہے۔ جب کہ تیسرا اور چوتھا جملہ تکلف آمیز، قدرے ثقیل اور عام بول چال سے ہٹ کر ہے۔ کسی بھی ادب پارے میں مواد اور اسلوب کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ فنکار یا ادیب و شاعر نے اپنے فکر و فن میں کیا پیش کیا ہے اور کس انداز سے پیش کیا ہے؟ یہ دونوں باتیں خصوصی طور پر توجہ اور دلچسپی کا سبب بنتی ہیں۔ ایک ناقد اپنی تنقید کی عینک سے انہیں دونوں باتوں (مواد و اسلوب) کو دیکھتا ہے اور فن پارے کا تجزیہ کرتا ہے۔ کوئی بھی ادب پارہ اسلوب سے خالی نہیں ہوتا۔ اس کے اندر کوئی نہ کوئی اسلوب ضرور پایا جاتا ہے۔ عام قارئین کو اس کا شعور و ادراک نہیں ہوتا، لیکن اہلِ نظر ادب پارے میں موجود اسلوب کی نوع بہ نوع قسموں کا اندازہ لگا لیتے ہیں کہ: تاڑنے والے قیامت کی نظر رکھتے ہیں

مکتوبات و خطوط، ادب یا پھر نثر کی معمولی قسم ہے، لیکن ان کے اندر بھی مختلف اسالیب پائے جاتے ہیں۔ خطوطِ غالب میں "مراسلہ بہ شکلِ مکالمہ" یا پھر مکالماتی اسلوب کی موجودگی پر ماہرینِ غالبیات کا اتفاق ہے۔ بہر کیف! جہاں ادب ہو، اس میں اسلوب کا پایا جانا ضروری ہے، خواہ وہ ادب نثر کی شکل میں ہو یا نظم کی صورت میں۔ سادہ نثر کی طرح سادہ طرزِ بیان اور سادہ اسلوب تقریباً سارے اہلِ ادب تحریر و تقریر میں استعمال کرتے ہیں۔ لیکن بعض اوقات ادب پاروں میں سادہ اسلوب کے علاوہ دشوار، ثقیل اور تکلف آمیز اسلوب بھی در آتے ہیں۔ اسی طرح زبان و بیان پر غیر معمولی دسترس رکھنے والے فنکار پُر کشش، انوکھا اور جدت و ندرت کے اسلوب سے بھی کام لیتے ہیں۔ یہ عمل کبھی اختیاری ہوتا ہے اور کبھی اضطراری۔ "جدتِ اسلوب" اور "ندرتِ طرزِ بیان" کے لیے بعض اوقات لسانی ساخت میں تبدیلی اور مسلمہ لسانی ضابطوں سے انحراف بھی کیا جاتا ہے۔ اس وقت ادب کے عام اسلوب اور عام ڈگر سے ہٹ کر گویا روایت سے بغاوت کی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلوب کی ایک تعریف "زبان و بیان کے مسلمہ ضابطوں سے انحراف" سے بھی کی گئی ہے۔ جب کوئی شاعر یا ادیب اپنے تخلیقی اظہار کے لیے اسلوب کا استعمال کرتا ہے تو وہ ہمیشہ اسے اس کی اصلی حالت میں نہیں برتتا، بلکہ اکثر اس میں تنوع، جدت اور ندرت پیدا کرتا ہے اور اس کام کو انجام

دینے کے لیے اسے زبان میں تراش خراش، کاٹ چھانٹ اور توڑ پھوڑ سے بھی کام لینا پڑتا ہے۔اس عمل سے جہاں شعری اظہار میں سہولت اور آسانی پیدا ہوتی ہے، وہاں اس کے ادبی سرمایے میں اضافہ ہوتا ہے۔نت نئی تراکیب وجود میں آتی ہیں اور مختلف پیرای؟ بیان سے اہلِ ادب کے کان آشنا آتے ہیں، جو بہر حال زبان کی توسیع وترقی میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔

اختر اورینوی نظم کی طرح نثر بھی بہت عمدہ لکھتے ہیں۔ان کی تحریروں میں زبان کی چاشنی، ادب کی حلاوت اور بیان کی لطافت پائی جاتی ہے۔بڑی شستہ اور رواں دواں نثر لکھتے ہیں،جس سے باذوق قارئین متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتے۔ان کی وقیع تحریروں میں ادبی نثری کے تقریبا سارے نمونے پائے جائے ہیں۔تنقید جیسے خشک موضوع میں بھی وہ دلکش اسلوب کا رنگ وروغن شامل کر کے اس کو مطلق تنقید کے بجائے "تخلیقی تنقید" کا نمونہ بنا دیتے ہیں۔ان کے اسلوبِ تحریر میں بلا کی کشش، جامعیت وجاذبیت اور ساحری کی کیفیت پائی جاتی ہے۔دلکشی ودلنشینی اور معنیٰ آفرینی ان کے اسلوبِ بیان کی سب سے بڑی خصوصیت ہے۔ان کے اسلوب میں جدت وندرت اور فنکارانہ صناعی کے ساتھ معنوی گہرائی پائی جاتی ہے۔وہ شاعری کی طرح نثر میں بھی الفاظ وتراکیب کا بڑا اچھوتا، تراشا اور شستہ نمونہ پیش کرتے ہیں،جس سے قارئین مسحور ہوئے بغیر نہیں رہتے۔اسلوب کی ایسی کشش اور دل آویزی ان کے معاصر افسانہ نگاروں اور نقادوں میں کم ہی دیکھنے کو ملتی ہے۔ڈاکٹر عبادت بریلوی، پروفیسر نورالحسن نقوی، وقار عظیم اور پروفیسر عبدالمغنی جیسے ناقدین نے ان کے پر کشش اسلوبِ تحریر کی تعریف کی ہے۔اختر اورینوی کے جاندار اور شاندار نثری اسلوب کے بارے میں پروفیسر لطف الرحمٰن لکھتے ہیں:

"ادب میں اسلوب کی بڑی اہمیت ہے۔کیوں کہ اسلوب کی جمالیاتی کشش اور حسن کارانہ دل آویزی ہی کسی تحریر کو ادب کے دائرے میں لانے کا سبب بنتی ہے۔بعدازاں یہ فیصلہ کیا جاتا ہے کہ یہ ادب کس درجے اور کس معیار کا ہے۔یہی (اسلوب) وہ پیمانہ ہے جو کسی ادیب کی عظمت و انفرادیت کی تشکیل وتجسیم کرتا ہے۔اختر اورینوی کے اسلوب میں بڑی شان وشوکت، پُر جلال، بلندی وعظمت، جمالیاتی سنجیدگی ومتانت، دل آویز وسعت وہمہ گیری، جاذبِ توجہ روانی اور ہمواری کے ساتھ ساتھ قابلِ قدر دلکشی ودلنشینی ہے۔ان کے پاس الفاظ کا ایک بحرِ بیکراں ہے۔وہ اپنی پسند اور ضرورت کے مطابق الفاظ کا انتخاب کرتے ہیں۔ان کے یہاں الفاظ کی بندش وچستی، تراکیب کی ندرت وجدت اپنی تمام تر معنویت وخصوصیت کے ساتھ موجود ہے۔وہ الفاظ کے استعمال میں بہت

ہی صناعانہ فنکاری سے کام لیتے ہیں۔ اردو کے کم ادیب الفاظ وتراکیب کے استعمال میں اتنی جدت طرازی اور ندرت آفرینی سے کام لینے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ وہ لفظوں کو معانی ومطالب کے نئے نئے گوشوں اور زاویوں سے متعارف کراتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اختر اورینوی کا اسلوب جتنی معنوی وسعت وہمہ گیری، باطنی عمق وگیرائی اور ظاہری دل کشی وجاذبیت اپنے دامن میں رکھتا ہے، اردو کے کم ہی ادیبوں کے اسلوب میں اتنی معنی آفرینی اور دلنشینی ہوگی۔

رنگین اور دلکش اسلوب: اختر اورینوی کے اسالیبِ بیان میں مختلف قسم کے اسلوب پائے جاتے ہیں۔ ذیل کی سطروں میں ان کے چند نمایاں اسلوب کی مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔ اختر ؟ کی خوب صورت نثر نگاری اور ان کے پُرکشش اسلوبِ تحریر کا یہ حسین پیراگراف ملاحظہ کریں :

" شاعری انسانی ثقافت کے گلستاں کا سب سے خوب صورت پھول ہے۔ یہ پھول چمنِ تہذیب ہی میں کِھلتا ہے اور اسی کی فضا سے آب ورنگ حاصل کرتا ہے۔ اسی کی زمین سے رس اور جس لیتا ہے۔ شاعری کو روح اور پیکر کسی تہذیب کی روایات اور تبدیلیوں سے ملتے ہیں۔ تہذیب وتمدن کے آب و گِل، فضا و ماحول، روایات وتاریخ، سے علاحدہ ہوکر فن کو نہ تو توانائی حاصل ہوسکتی ہے، نہ زیبائی۔ شاعری تو نہایت نازک، لطیف اور پُر تاثیر فن ہے۔ اسے ہم فنونِ لطیفہ کا عطر مجموعہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ عطرِ شاعری کی کشید تہذیب وثقافت کے انگنت پھولوں سے ہوتی ہے، جو مختلف خیابانوں میں کھلتے ہیں۔ اس میں بوئے ماضی بھی رقصاں ہوتی ہے اور نکہتِ حال بھی۔ سائنس نے شعاؤں کی دریافت کی ہے، برقی لہروں کا پتہ چلایا۔ مقناطیسی موجوں کا انکشاف کیا۔ لہروں اور موجوں کے بیشمار ارتعاشات سے انسان باخبر ہوا ہے اور ابھی کائناتِ کی سرحدوں کا آغاز ہوا ہے۔ اہلِ حکمت نے اس حقیقت سے پردہ اٹھادیا ہے کہ برق ومقناطیس ایتھر اور ریڈیو کی وہ موجیں زیادہ پُر اثر اور نفوذ کرنے والی ہوتی ہیں، جن کی رفتارِ تموج تیز تر ہوتی ہے۔ جب رفتارِ تموج تیز ہو تو موجوں کے درمیان کا فاصلہ گھٹتا چلا جاتا ہے اور شدتِ تاثیر بڑھتی چلی جاتی ہے۔ فنونِ لطیفہ کی تاثیر بھی برقی، مقناطیسی اور ریڈیائی لہروں کی طرح ہوتی ہے۔ فنِ شاعری سے منعکس ہونے والی لہریں دوسرے فنون کی لہروں سے زیادہ تیز رفتار، متموج اور لطیف ہوتی ہیں۔ (نقش ہائے رنگ رنگ، مضمون " غالب کے استعارات وعلامات"، ص 168۔169، ناشر: شعبہء اردو پٹنہ یونیورسٹی، پٹنہ)

اختر اورینوی کی تنقید میں یہ مناظر بار بار دیکھنے کو ملتے ہیں کہ وہ تنقید کے دائرے سے نکل کر شاعری کی سرحد میں داخل ہوجاتے ہیں۔ اختر کی تنقیدی تحریروں کا یہ اسلوب کافی حد تک نیاز فتح

پوری سے ملتا جلتا ہے۔جس طرح نیاز نے اپنی تحریروں میں "شاعرانہ نثر" کے نمونے پیش کیے ہیں، اسی طرح اختر بھی اپنے شاعرانہ اسلوب کی مدد سے نثر میں دلکشی پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں،لیکن اس وقت ان کی تنقید،تقریظ اور مداحی کا روپ دھار لیتی ہے۔ پروفیسر عبدالمغنی نے ایک جگہ لکھا ہے کہ اختر اور ینوی کا اسلوب بڑا رنگین، پُر شوکت اور تہہ دار ہے۔اس رنگین، دلکش اور پُر شوکت اسلوب کا نمونہ اس سے بہتر اور کیا ہوسکتا ہے، جس میں وہ اپنے مخصوص نظریۂ فن کی وضاحت کچھ اس طرح کرتے ہیں :"جنتِ فن نام ہے حسن کاری کا، گہرے مشاہدے، ذکی احساس، مخلص جذبات، بلند تخئیل، انسانی محبت، اخوتِ عامہ، حرکت وعمل، مساوات وحریت، گداز و ہمدردی، قربانی وایثار اور موجودہ دنیا سے بہتر دنیا کی تخلیق کا۔(ماہنامہ مہرِ نیم روز، کراچی، ص:207، اختر اور ینوی نمبر)

سادہ اسلوب: صاحبِ بحر الفصاحت کی صراحت کے مطابق اردو نثر کی تاریخ میں سادہ نثر اور رنگین نثر شروع سے مروج رہی ہے۔ مذکورہ بالا نثر "رنگین نثر" کی مثال ہے اور ذیل کی نثر "سادہ نثر اور سادہ اسلوب کی مثال ہے۔زندگی صرف مارکسیت کا نام نہیں۔زندگی صرف گاندھی مت یا اسلام کا نام بھی نہیں۔زندگی کفر بھی ہے اور اسلام بھی۔زندگی نیرنگ بداماں ہے، چھل چھبیلی ہے، متحرک ہے، سنجیدہ بھی ہے اور کھلنڈری بھی، گریاں بھی ہے اور خنداں بھی۔زندگی عظیم ہے۔اس میں سلامت روی بھی ہے اور کج روی بھی۔ادب وشعر میں کوئی مخصوص زاویہ پیش کیا جاسکتا ہے، مگر یہ حکم نافذ کرنا کہ بس اسی زاویہ سے زندگی کو دیکھا جائے، ادبی آمریت ہے، کبر ہے، حماقت ہے، نارسائی اور جہالت ہے۔(قدر ونظر، ص:192، مطبوعہ: ادارہ فروغ اردو لکھنؤ)

اچھی نثر کی ایک بڑی خوبی یہ بھی ہے کہ جملے چھوٹے چھوٹے ہوں اور اپنی جگہ پر مکمل ہوں۔مرکب جملے (Complex Sentences) نثر کے حسن کو متاثر کرتے ہیں اور طبیعت پر بعض اوقات گراں گزرتے ہیں۔اختر کی تحریروں میں بالعموم متوسط انداز کے بڑے بڑے جملے ملتے ہیں،لیکن بعض مقامات پر چھوٹے چھوٹے جملے بھی ان کی نثر کی خوبی میں اضافہ کرتے ہیں۔مثلاً : آفتابِ رومان آسمانِ ادب پر چمک رہا ہے۔دنیائے ادب میں زندگی کی حِدّت ہے۔گرم جولانی ہے۔نمو ہے۔تنوع اور تیزی ہے۔افق پر بجلیاں بھی تڑپتی دکھائی دیتی ہیں۔دَل کے دَل مست ہاتھیوں کی طرح بادل بھی امڈیں گے بارشیں بھی ہوں گی اور ٹوٹ کر ہوں گی۔ہر سو جل تھل ہوگا۔کہیں کہیں سیلاب بھی آئیں گے۔ندیاں چڑھیں گی۔(تحقیق وتنقید، ص:۷۷، ص: شاد بکڈپو، پٹنہ)

تخلیقی شان کا حامل اسلوب: تنقید کا تعلق ادبِ لطیف سے ہے۔لطافت، سنجیدگی اور سادگی اس کی

پہچان ہے اور تنقید میں چوں کہ فن اور فن پارے کے حسن و قبح کا اظہار ہوتا ہے، اس لیے ناقد کو سنجیدہ اسلوبِ بیان ہی زیب دیتا ہے۔ تنقید، تفہیم اور توضیح و تشریح کا فریضہ انجام دیتی ہے اور کبھی یہ دوٹوک فیصلہ بھی سناتی ہے، اس جہت بھی اس کے اندر سادہ اور سہل اندازِ بیان کا پیدا ہو جانا، ایک فطری امر ہے۔ حالی، شبلی، کلیم الدین احمد، اور سید احتشام حسین وغیرہ کی تنقیدات میں بالعموم یہی اوصاف پائے جاتے ہیں۔ لیکن جہاں تک راقم نے محسوس کیا ہے، اختر اورینوی کے اسلوبِ تحریر اور تنقیدی اندازِ بیان میں تخلیق کی شان پائی جاتی ہے۔ اردو تنقید کو تخلیق کے قریب لانے اور اس کو تخلیق کے شانہ بشانہ کھڑا کرنے میں آل احمد سرور اور اختر اورینوی نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ اختر کی تنقیدی تحریروں میں سرور سے زیادہ ادبی کشش، جمال آفریں انداز اور تخلیقی شان پائی جاتی ہے۔ نیز عام ناقدین و معاصرین کے برعکس اختر کا تنقیدی اسلوب بڑا شستہ و شگفتہ، رنگین، دلنشیں اور رواں دواں ہے۔ ان کے اسلوب کی دلکشی قارئین کو مسحور کرتی ہے۔ "اختر کا اسلوبِ بیان" ایک مستقل عنوان ہے، جس پر ایک مدلل تحقیقی مقالہ یا مختصر رسالہ تحریر کیا جا سکتا ہے۔ اختر کے تنقیدی اسلوب کا یہ رواں دواں، دلنشیں، سنجیدہ، ستھرا، شستہ، نکھرا اور تسلسل آمیز اندازِ بیان دیکھیں: "زندہ سیرت نگاری بغیر داخلی آئینہ داری کے ناممکن ہے۔ افسانوں کی گہرائی اور گیرائی ان کی ظاہری سطحوں سے کہیں زیادہ بڑی چیز ہے۔ کامیاب کردار نگاری صرف خدوخال کی پیشکش نہیں، صرف عادات و خصائل کی ترجمانی نہیں۔ یہ احساسی، جذبی، تخیلی اور فکری زندگی کی رونمائی ہے۔ جب تک کردار کی نفسی زندگی نہیں ابھرتی، کردار ٹین کے گڈّے معلوم ہوتے ہیں۔ نفسی زندگی کی ترجمانی ایک پیچیدہ عمل ہے، نفسی زندگی عمل، ردِعمل، اثر و تاثیر، جبلتوں اور شعور کا ایک پیچیدہ مرکب ہے۔ اس لیے زندہ کردار نگاری کے لیے تجزیۂ نفس کی ضرورت پڑتی ہے۔ نفس انسانی کی نیرنگی سے واقف ناول نگار ہی عمدہ کردار نگاری کر سکتا ہے۔۔۔ ایک صاحبِ فن ناول نگار زندگی کا جیتا جاگتا نقشہ بناتا ہے۔ وہ کرداروں کو شخصیت اور سیرت عطا کرتا ہے۔ وہ آدم و حوا کے پتلے بنا کر ان میں روح پھونکتا اور انہیں "اسماء" سکھاتا ہے۔ فرشتے نہیں جانتے، مگر خدا جانتا ہے کہ آدم ایک منفرد اور نادر وجود ہے۔ اس میں علمِ اسما نے صفات پیدا کیے ہیں۔ وہ نہ فرشتہ ہے اور نہ شیطان۔ وہ خدا کی وسیع زمین میں خون بھی بہائے گا اور پرورشِ حیات اور تعمیرِ معاشرہ بھی کرے گا۔ (تحقیق و تنقید، ص: 137۔136)

اسلوبِ اختر سے متعلق عبدالمغنی صاحب کا یہ بیان سو فیصد درست ہے کہ:

"اختر صاحب کا اسلوب بڑا رنگین، پُرشوکت اور تہہ دار ہے۔ بعض اوقات وہ اپنی باتوں کو دلچسپ اور

سحر آفریں بنانا چاہتے ہیں۔ اس مقصد کے لیے جہاں وہ فارسی وعربی کی پُر وقار ترکیبیں استعمال کرتے ہیں، وہیں بھاشا کے ہلکے پھلکے الفاظ سے بھی جادو جگاتے ہیں۔ دراصل وہ بلاغتِ اظہار کے درپے ہیں، جس کو وہ ایک اہم چیز سمجھتے ہیں۔ آل احمد سرور کی طرح انہوں نے بھی تنقید کو تخلیق سے قریب تر لانے کی کاوش کی ہے"۔ (نقطۂ نظر، ص:۲۱۱، مطبوعہ: کتاب منزل، پٹنہ)

طیبانہ اسلوب: اختر اورینوی کی تنقیدی وافسانوی تحریروں میں "خطیبانہ اسلوب" کی آمیزش بھی پائی جاتی ہے۔ اختر نے زندگی اور مسائلِ حیات کا بڑی گہرائی کے ساتھ مطالعہ ومشاہدہ کیا تھا۔ زندگی کے مصائب وآلام، کمزوں پر ہورہے مظالم اور اس دکھ بھری زندگی نے ان کے احساس میں ایک خاص طرح کی شدت پیدا کردی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ جب ان واقعات کو وہ بیان کرنے لگتے ہیں تو فطری طور پر ان کے اندر طوفانوں کی سی تندی اور بجلیوں جیسی کڑک پیدا ہوجاتی ہے اور یہی چیز ان کو "خطیبانہ اسلوب" اور "پُر جوش اندازِ بیان" اختیار کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ وقار عظیم کے بقول: اختر اورینوی کے یہاں جذباتی گرمی اور خطیبانہ جوش حد سے زیادہ ہے۔ وہ کوئی بات کہنا چاہتے ہیں تو تشبیہوں، استعاروں اور مہتم بالشان ترکیبوں کا ایک دریا سا امنڈنے لگتا ہے اور دریا کی روانی کے آگے ہر خیال ایک تنکے کی طرح بہتا نظر آتا ہے۔ الفاظ کی نشست وبرخاست میں، فقروں اور جملوں کی چستی میں افسانہ سے کہیں زیادہ وعظ یا کسی سنجیدہ مضمون کی سی خشکی پیدا ہوجاتی ہے۔

(نیا افسانہ، ص:186۔185، ناشر: ساقی بکڈپو، دہلی)

ذیل کا نمونۂ تحریر دیکھیں کہ اس میں شاعرانہ نثر اور خطیبانہ اسلوب کا عکس صاف دکھائی دے گا :

"میں سوچتا ہوں کہ یہ اندھا دھند پیداوارِ ادب اور اس کی کھیپ کے لیے یہ نراجی دوڑ بھاگ، یہ بہیمانہ شورشیں اور یہ ناتراشیدہ جوشِ نمو ہندوستانی سماج کے لیے مسرت آفریں، مفید اور تزکیہ پیدا کرنے والا وسیلہ ہے یا بدحواسی، بدصورتی اور ضرر پیدا کرنے کا سامان کیا یہ ناشائستہ ہنگامے خود ادب وفن کے لیے معیار آفریں اور ترقی کے ذریعے ہیں ادب بے ادبی نہیں اور شاعری بے شعوری ہے۔ ادب وشعر کی دنیا بڑی ستھری، سنوری، سجی سجائی دنیا ہوتی ہے۔ شائستگی اور تہذیب ادب وشاعری کا سرچشمہ ہے۔ یہاں انتخاب، تراش وخراش، آراستگی اور حسنِ صناعت ضروری ہے۔ ادبی دنیا کو ایک جنگل نہیں ہونا چاہیے۔ بلکہ اسے ایک آراستہ خیاباں، ایک تراشیدہ گلستاں، منتخب بوستاں اور ایک رچا، سجا، سنورا اور صاف ستھرا باغ ہونا چاہیے۔ (ماہنامہ معاصر، پٹنہ، ص:۱، مارچ 1945)

☆☆☆

Akhtar Orinvi : Arbab-e-Ilm-o-Adab ki Nazar mein by Dr. Naim Raza
(Banka, Bihar) cell-7371818327
ڈاکٹر نعیم رضا (بانکہ، بہار)

اختر اورینوی : اربابِ علم وادب کی نظر میں

حقیقت کا اعتراف انسان کی فطرت اور عظیم شخصیت کے ہمہ جہت کارناموں کی تشہیر ایک زندہ قوم کی علامت ہے۔ اختر اورینوی بلا مبالغہ ایک عظیم شخصیت کے مالک تھے۔ ان کی شخصیت میں بڑا تنوع اور ہمہ گیری تھی۔ وہ بیک وقت متعدد اوصاف وکمالات کے جامع تھے۔ انہوں نے علمی، ادبی، اخلاقی، تعلیمی، تدریسی، تحقیقی اور تنقیدی شعبوں میں گراں قدر نقوش یادگار چھوڑے ہیں۔ وہ استاد، معلم، مقرر، مبلغ، ادیب، شاعر، نثر نگار، افسانہ نویس، ناول و ڈراما نگار، محقق اور ناقد تھے۔ غرض موصوف ادب کی مختلف صنفوں میں کمال رکھتے تھے۔ شخصِ واحد میں اتنے سارے کمالات کا یکجا ہو جانا باعثِ حیرت واستعجاب ہے۔ ماہنامہ ساغرِ نو، پٹنہ اور ماہنامہ مہرِ نیم روز، کراچی کا "اختر اورینوی نمبر" ان کے علمی وادبی کمالات کے اعتراف کا واضح ثبوت ہے۔ اردو ادب کی نامی گرامی ہستیوں نے اختر کی باوقار شخصیت اور ان کے ہمہ جہت کارناموں کا کھلے دل سے اعتراف کیا ہے۔ ذیل میں چند نامور اہلِ علم وادب کے وقیع تاثرات پیش کیے جاتے ہیں :

پروفیسر کلیم الدین احمد: اختر نوجوان ادیب ہیں۔ ان کی شہرت بہار کی حدود میں محدود نہیں۔ ان کی تحریریں ہندوستان کے اکثر و بیشتر رسالوں میں شائع ہوئی ہیں اور شائع ہوتی رہتی ہیں۔ اختر ؟ کے ادبی کارنامے محدود قسم کے نہیں۔ وہ افسانہ نگار ہیں۔ شاعر ہیں اور نقاد ہیں۔ انہوں نے دو ڈرامے بھی لکھے ہیں۔ ان کے افسانوں، ان کی نظموں اور ان کی تنقیدوں سے اردو دنیا واقف ہے۔ ان کے افسانے خصوصاً نہایت مقبول ہیں۔ (پیش لفظ "منظر و پس منظر" ص 12، ناشر: مکتبہ اردو، لاہور)

پروفیسر آل احمد سرور: اختر کی علمی و ادبی صلاحیت، ان کی ذہانت، ان کی خطابت، ان کی انتظامی استعداد، ان کے خلوص اور محبت کا قائل ہوں۔ وہ صرف اردو کے پروفیسر ہی نہیں ہیں، بہت اچھے معلم ہیں۔ علم کے منصب کو پہچانتے ہیں۔ طلبہ کی پوشیدہ صلاحیتوں کو ابھارتے ہیں۔ انہیں علمی کاموں میں

لگاتے ہیں۔ ان کے ذوق کو بلند کرتے ہیں۔ ان میں زندگی کی اچھی قدروں کا احساس پیدا کرتے ہیں۔ انہیں جہدِ حیات کے آداب سکھاتے ہیں۔ انہیں انسان بناتے ہیں..... اختر صاحب شاعر بھی ہیں، افسانہ نگار بھی، ناولسٹ بھی اور نقاد بھی۔ ان کی شاعری میں سنجیدگی اور گہرائی ہے ..... اختر ہمارے ناقدوں میں ایک امتیازی صفت رکھتے ہیں۔ ان کی تنقید صرف تشریح نہیں ہوتی، بلکہ کسوٹی بھی ہے۔ ان کے یہاں ادب کے اعلیٰ قدروں کا احساس ہے اور فن پاروں کو ان قدروں کی رو سے پرکھنے کی کوشش بھی۔ (مہرِ نیم روز، ص 102۔101،،۔1977)

پروفیسر سید احتشام حسین: اختر اورینوی نے ناول بھی لکھے ہیں اور افسانے بھی۔ شاعری بھی کی ہے اور ڈرامے بھی تخلیق کیے ہیں۔ تنقیدی مضامین بھی لکھتے رہے ہیں اور تخلیق کی راہوں سے بھی گزرے ہیں اور قابلِ غور بات یہ ہے کہ ان سب میں انہوں نے اپنے گہرے نقوش چھوڑے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ان تخلیقات کا جائزہ لیا جائے تو غالباً ان کی تخلیقی صلاحیتوں کا اعلیٰ ترین مظہر ان کے افسانے اور تنقیدی مضامین قرار پائیں گے..... اختر کا ذہن تخلیقی ہے اور وہ محسوس کر کے لکھتے ہیں۔ گو ان کے چند مضامین ہلکے پھلکے معلوم ہوتے ہیں، لیکن مجموعی طور سے ان کا اندازِ بیان دلکش، ان کے تجزیے عالمانہ اور ان کے اصول ادبی ہیں۔ اختر اورینوی کے تنقیدی مضامین کا مطالعہ کرنے والا محسوس کرے گا کہ ان کے نظریاتِ تنقید، محض ادبی تنقید کے مطالعے کا نتیجہ نہیں، بلکہ اس کے سوتے ان کے تصورِ حیات سے مل جاتے ہیں جو کائنات کو حسین اور متوازن دیکھنے کا متمنی ہو۔ (ایضاً، ص 224)

پروفیسر معین الدین دردائی: اختر صاحب شاعر بھی تھے باکمال اور دل نواز شاعر علم۔ و فضل نے جہاں ان کو قادر الکلامی بخشی تھی، وہاں ان کے دردمند دل نے سوز و درد اور اثر بھی پیدا کر دیا تھا۔ ان کی شاعری میں بڑی دلکشی اور جاذبیت پائی جاتی ہے۔ موجودہ ترقی پسند شعرا میں ان کا مخصوص مقام ہے۔ لیکن ان کے یہاں علی سردار جعفری کی طرح "آگ" اور "خون" کی بہتات نہیں ملتی۔ ترقی پسند ہوتے ہوئے بھی ان کے یہاں مذہب کا حد درجہ لحاظ اور احترام پایا جاتا ہے۔ سنجیدگی اور شائستگی کا دامن وہ کسی وقت اور کسی حالت میں بھی نہیں چھوڑتے۔ غزل اور نظم دونوں ہی کہتے تھے۔ نظم میں میرا خیال ہے وہ ڈاکٹر عظیم الدین احمد مرحوم سے زیادہ متاثر تھے۔ تغزل میں ان کے یہاں رومانیت، محاکات اور معاملہ بندی کافی پائی جاتی ہے۔ مجھے ان کی نظمیں اور غزلیں دونوں ہی پسند ہیں۔

(ایضاً، ص، 147)

پروفیسر سید شہاب الدین احمد: اختر اورینوی کے کلام میں محاسن بھی ہیں اور تشنگی بھی، مگر ایک خصوصیتِ

یگانہ ان کے کلامِ نظم ونثر میں طرہء امتیاز کی حیثیت رکھتا ہے اور وہ ہے: "اعتبارِ وجودیتِ انسانی"۔ یہ اعتبار اتنا مستحکم اور معتصم ہے جو کبھی نگار خانہء دنیا کی فریب نگاری کا شکار نہ ہوا اور تخیلِ شکست کو بے معنی بتاتا ہوا منزل کی طرف بڑھتا ہی رہا۔ حصولِ نصب العین کے لیے اختر نے ایک طرف شعر وسخن کو اپنایا تو دوسری طرف نثر نگاری کو گلے لگایا..... میں جب ڈاکٹر اختر کے شعری اور نثری ماہیت پر غور کرتا ہوں تو مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ دونوں اصنافِ ادب علت ومعلول سے الگ ہو کر اسرارِ حیات، ارادتِ قلبی اور سعیِ پیہم کے مبلغ ہیں۔ (ایضاً، 123)

پروفیسر عطاء الرحمٰن عطا کاکوی: پروفیسر اختر اورینوی کو میں ان کے لڑکپن سے ہی جانتا ہوں۔ ان کی نانیہال "کاکو" میں تھی اور وہ وہاں اکثر آیا جایا کرتے تھے۔ اپنی ذہانت اور ذکاوت کی بنا پر وہ کم سنی ہی میں ادبی اور علمی شعبوں میں ممتاز رہے۔ اگر چہ اپنی صحت کی خرابی سے عرصے تک تعلیمی مشغلے سے محروم رہے، پھر بھی صحت یاب ہو کر تعلیم کی تکمیل کی اور بحیثیتِ مقرر، افسانہ نگار اور ناقدِ ادب اردو دنیا میں ممتاز رہے۔ ان کے ایک ماموں حسن امام شمسی شاعر تھے۔ اس لیے لڑکپن ہی سے شاعری کا ذوق پیدا ہوا اور دیگر علمی مشاغل کے علاوہ شاعری میں بھی انہوں نے نمایاں حصہ لیا اور ایک خوش گو شاعر کی حیثیت سے ادبی حلقوں میں خراجِ تحسین حاصل کیا۔ ان کے دو مجموعے "انجمنِ آرزو" اور "یک چمنِ گل" منظرِ عام پر آ چکے ہیں، جن سے ان کی فکری صلاحیت کا پتہ چلتا ہے۔

(اختر اورینوی: حیات اور شاعری، ص: 124، ناشر: عشرت پبلیکیشنز، اورنگ آباد)

قاضی عبدالودود: ڈاکٹر اختر اورینوی اردو کے مشہور افسانہ نگاروں میں ہیں اور غالباً اس سے عام طور پر اتفاق کیا جائے گا کہ بہار کے اردو بولنے والوں میں ان سے بہتر افسانہ نویس پیدا نہیں ہوا۔

(بہار میں اردو فکشن: ایک تنقیدی مطالعہ، ص: 124، مطبوعہ: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی)

ڈاکٹر سید اعجاز حسین: پروفیسر اختر اورینوی بہار کے ان اربابِ قلم میں سے ہیں جنہوں نے تنقید، افسانہ نگاری، ناول نویسی، ڈراما نگاری اور شاعری ہر صنف میں اپنا مقام پیدا کر لیا ہے۔ پٹنہ یونیورسٹی میں آنے سے پہلے ہی ان کی ادبی شہرت کی ابتدا ہو چکی تھی۔ شروع میں ان کی توجہ تخلیقی ادب کی طرف زیادہ رہی۔ پھر تنقید کی طرف مائل ہوئے۔ اس وقت بھی آپ ادب کے دونوں پہلوؤں کو فیض پہنچا رہے ہیں..... شعر وادب کے عام مسائل پر لکھنے کے علاوہ اختر اورینوی نے بہار میں اردو زبان وادب کے ارتقا پر بہت اہم کام کیا ہے اور بعض ایسے گوشوں پر روشنی ڈالی ہے جو اس وقت تک اندھیرے میں تھے۔ اس وقت بھی وہ جدید بہار کے ادیبوں اور شاعروں سے تاریخِ ادب کے

طالب علموں کو روشناس کرانے میں لگے ہوئے ہیں۔ ان کا اسلوب بڑی شگفتگی اور رنگینی کا حامل ہے اور چوں کہ تخلیقی ادب بھی ان کی جولانگاہ ہے، اس لیے اس کی جھلک ان کے تنقیدی اسلوب میں بھی نظر آجاتی ہے۔ (مختصر تاریخِ ادب اردو، ص:520-519، مطبوعہ: ادارہ فروغ اردو، لکھنؤ)

پروفیسر عبدالمغنی: اختر اورینوی ایک رنگارنگ شخصیت کا نام تھا، جو جہد وعمل سے اتنی ہی دلچسپی رکھتی تھی، جتنی علم وفن سے اور جسے علم وفن کے بہترے شعبوں میں درک تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اردو ادب میں اختر اورینوی کا کارنامہ کسی ایک صنف تک محدود نہیں۔ افسانہ، ناول، ڈراما، شاعری، تحقیق اور تنقید سبھی دائروں میں موصوف کے کمالات ہیں۔ بہرحال ان کی خدمات کا بیشتر اور بہتر حصہ دو صنفوں میں پایا جاتا ہے، ایک افسانہ، دوسرے تنقید۔ جس طرح وہ اردو افسانہ نگاری میں کرشن چندر، منٹو اور بیدی کے ساتھ چار بڑوں میں تھے۔ اسی طرح تنقید میں آل احمد سرور، کلیم الدین احمد اور احتشام حسین کے ساتھ مل کر وہ ان ارکانِ اربعہ کی تشکیل کرتے ہیں ..... اختر اورینوی کے تنقیدی مضامین پر ایک نظر ڈالنے سے واضح ہوتا ہے کہ ان کے تنقیدی موضوعات بہت وسیع اور رنگارنگ ہیں۔ قدیم و جدید، نظم ونثر اور نظریاتی وعملی، ہر قسم کے ادبی مسائل پر انہوں نے اظہارِ خیال کیا ہے، اس سے ان کے ذہن کے ہمہ جہت ہونے کا ایک ثبوت ملتا ہے۔ اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ ان کا ذوق وشوق کافی محیط تھا۔ (معیار واقدار، ص:۱۹۱، ناشر: حکمت پبلیکیشنز، پٹنہ)

ڈاکٹر عبادت بریلوی: اختر اورینوی نے بھی تنقید کی طرف توجہ کی ہے۔ ان کے مضامین کا ایک مجموعہ "کسوٹی" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ دوسرا "تنقید جدید" پریس میں ہے۔ اقبال پر بھی انہوں نے ایک چھوٹی سی کتاب لکھی ہے۔ ان سے ان کے تنقیدی خیالات کا اندازہ ہوتا ہے۔ وہ ادب وشعر میں ماحول اور وراثت کو بڑی اہمیت دیتے ہیں۔ ماحول میں شخصی اور سماجی دونوں کا اثر اس پر ہوتا ہے اور وراثت میں شخصی اور ادبی دونوں کے اثرات نظر آتے ہیں۔ چنانچہ وہ انہیں باتوں کو سامنے رکھ کر ادب وشعر کا مطالعہ کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں ان کی بحث نہایت خیال انگیز ہوتی ہے۔ وہ بہت گہرائی میں جانے کی کوشش کرتے ہیں۔ پھر ادبی ماحول اور مذہبی ساخت کے اثرات بھی دکھاتے ہیں۔ تہذیب اور کلچر کے اثرات کا تجزیہ بھی کرتے ہیں اور پھر فنی خوبیوں کا پتہ بھی لگاتے ہیں۔

(اردو تنقید کا ارتقا، ص:595-593، ناشر: چمن بک ڈپو، اردو بازار، دہلی)

رضوان اللہ آروی: اختر اورینوی بنیادی طور پر افسانہ نگار ہیں، لیکن "حسرتِ تعمیر" نے یہ ثابت کر دیا کہ وہ ایک کامیاب ناول نگار بھی ہیں۔ پریم چند کی طرح انہوں نے بھی چھوٹا ناگ پور جیسے نسبتاً کم آباد

علاقے کو اپنے ناول کا موضوع بنایا ہے اور وہاں کی معاشرت کا نقشہ کھینچا ہے۔ اسلم آزاد نے سچ کہا ہے کہ " آدی باسی قبیلوں کے معاشرے کی ایسی زندہ تصویر اور کسی زبان کے ناول میں شاید ہی دیکھنے کو ملے۔ (سہ ماہی ادیب، علی گڑھ، خصوصی شمارہ اردو زبان وادب نمبر، جولائی تا دسمبر 1993)

پروفیسر سید علی حیدر: اختر اورینوی کی شخصیت کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ آپ صوبہ ءبہار کے آسمانِ ادب کے تابندہ اختر ہیں۔ قدرت نے آپ کو بہت سے صفات سے متصف کیا ہے۔ آپ ایک شاعر، ڈرامہ نگار، بے لاگ ناقد اور کامیاب افسانہ نگار ہیں.....آپ اول و آخر افسانہ نگار ہیں، بعد میں شاعر، ڈراما نگار اور ناقد۔ آپ کی طبیعت بلند رسا، تخیل بلند پرواز، نظر دور بیں اور قوتِ مشاہدہ نہایت ہی تیز ہے۔ محض ایک نظر میں حقیقت تک پہنچ جاتے ہیں۔ جزو میں کُل کا عکس دیکھ لیتے ہیں۔ زندگی کی ظاہری ہماہمی میں اس کے باطنی اضمحلال اور پژمردگی کو پا لیتے ہیں۔

(نقدِ ادب، ص:144۔143، مطبوعہ: دی آزاد پریس، سبزی باغ، پٹنہ)

پروفیسر نورالحسن نقوی: اختر اورینوی کی ادبی کاوشوں سے اردو ادب میں صوبہ ءبہار کا نام روشن و بلند ہوا۔ افسانہ، ناول، ڈراما، شاعری، ان سب اصناف میں انہوں نے خامہ فرسائی کی۔ لیکن تنقید بھی ان کی توجہ سے محروم نہیں رہی اور اس میدان میں بھی انہوں نے قابلِ قدر کام کیا۔

(تاریخِ ادبِ اردو، ص:462، ناشر: ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ)

ڈاکٹر مظہر امام: پریم چند اور علی عباس حسینی کے دوش بدوش اچھے افسانہ نگاروں کی جو نئی پودا بھری، اس میں اختر اورینوی کا نام نمایاں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جس نسل نے اردو افسانے کو حقیقت نگاری کی نئی پیچیدگوں اور فنی نزاکتوں کی نئی بلندیوں تک پہنچایا، اس میں اختر اورینوی کا نام بڑی اہمیت کا حامل ہے اور یہ اہمیت اس لیے اور بھی بڑھ جاتی ہے کہ کرشن چندر، بیدی اور صفِ اول کے دوسرے بہت سے افسانہ نگار اختر اورینوی کے بعد آئے اور اس لیے شاید یہ قیاس غیر مناسب نہ ہو کہ انہوں نے اورینوی کی جلائی ہوئی شمع سے کسی نہ کسی حد تک ضرور اکتسابِ نور کیا۔ اورینوی کی حیثیت ان افسانہ نگاروں (کرشن و بیدی) کے پیش رو کی ہے۔ اختر اورینوی کی شخصیت ہمہ گیر ہے، اس لیے ان کے قلم کی جولانیاں ادب کی مختلف اصناف میں اپنا جلوہ دکھاتی ہیں۔ افسانہ، ڈراما، ناول، تنقید، تحقیق، ادبی تاریخ، شاعری (غزل، پابند نظم، آزاد نظم)۔ نیاز فتح پوری کے علاوہ ہمارے ادب میں شاید ہی کوئی ایسی شخصیت ہو، جس نے ادب کی اتنی متنوع اصناف میں طبع آزمائی کی ہو اور حسبِ توفیق داد بھی وصول کی ہو۔

(آتی جاتی لہریں،ص:193۔192، ناشر:مظہرامام،مطبوعہ:ایم. آر. آفسیٹ پرنٹرز،نئی دہلی)

پروفیسرعبدالحنان سبحانی: بہار کے سپوت ڈاکٹراختر اورینوی ایک ہمہ گیر شخصیت کے مالک تھے۔ بیک وقت ادب کے کئی شعبے ان کے قلم کے زیرِ بارمنت رہے۔شاعری،افسانہ نگاری،ناول،ڈراما نگاری، تنقید وتحقیق،انشا پرداز،معلمِ ادبیات،مقرراور مبلغِ اسلام! سب ایک ہی شخصیت کے گونا گوں عکس ہیں۔ایک ہی چیز کی تصویریں ہیں جومختلف زاویوں سے لی گئی ہیں۔اتنی ہمہ گیری وہمہ جہتی شاذونادر ہی کسی کا حصہ ہو پاتی ہیں۔قدرت نے بڑی فیاضی سے ان کے دل نواز پیکر میں ظاہری وباطنی خوبیاں بھر دی تھیں۔

سوانجمن ہے جذب اک اختر کی ذات میں کیوں کر نہ چار چاند لگائیں صفات میں

(بہار میں اردو تحقیق وتنقید،ص:107۔106، ناشر:ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،دہلی)

ڈاکٹر قاسم فریدی: اختر اورینوی کی ادبی خدمات بے حد اہم اور وقیع ہیں۔ وہ ایک نابغہ اور عبقری شخصیت کے مالک تھے۔ان کی نثری اور شعری تصانیف قابلِ قدر ہیں۔بحیثیتِ افسانہ نگاراور ناقد اردو دنیا میں زیادہ مشہور ہوئے۔منظرو پس منظر،کلیاں اور کانٹے،انارکلی،بھول بھلیاں،سیمنٹ اور ڈائنامائٹ،کیچلیاں اور بالِ جبریل اور سپنوں کے دیس میں،ان کے مشہور افسانوی مجموعے ہیں۔ اختر اورینوی کی تنقید میں اعتدال وتوازن موجود ہے۔ان کے متعدد تنقیدی اور تحقیقی مجموعے منظرِ عام پر آچکے ہیں۔قدرونظر،مطالعہ ؟ اقبال،مطالعہ ؟ نظیر،تحقیق وتنقید (جدید)،کسوٹی،سراج ومنہاج، مطالعہ ومحاسبہ،اور " گذارش (اداریوں کا مجموعہ) وغیرہ کے مطالعے سے ان کی اعلیٰ درجے کی تنقیدی بصیرت کا اظہار ہوتا ہے۔بہ حیثیتِ ناول نگار بھی ان کا مرتبہ بلند ہے۔

(اختر اورینوی: حیات اور شاعری،ص:12، ناشر: شہرت پبلیکیشنز،اورنگ آباد)

ڈاکٹر اعجاز علی ارشد: پروفیسر اختر اورینوی ایک ہشت پہلو شخصیت کے مالک تھے۔معلم،مقرر،نقاد، افسانہ نگار،شاعر،محقق اور ڈراما نگار کی حیثیت سے وہ تقریباً تیس برسوں تک ملک کی علمی وادبی دنیا میں ایک نمایاں حیثیت کے حامل رہے ہیں.......... حال ہی میں نومبر 1941 سے دسمبر 1949" معاصر" پٹنہ کے لیے لکھے گئے ان کے اداریوں کا انتخاب محترمہ شکیلہ اختر نے ترتیب دے کر شائع کیا ہے،جس سے ان کی اعلیٰ صحافتی خوبیوں کا بھی اندازہ ہوتا ہے.......... مجموعی طور پر اختر اورینوی کی ہمہ گیر شخصیت کا مکمل عکس ان کی تنقیدی نگارشات میں نظر آتا ہے۔ان کے تنقیدی نقطہ ؟ نظر میں مشرق ومغرب کا حسین امتزاج ہے۔(بہار میں اردو تنقید،ص:57۔56، ناشر: مگدھ پنچ، پٹنہ)

ڈاکٹر محمد منصور انصاری: پروفیسر اختر اورینوی کی شخصیت ایک غیر معمولی اور ہمہ جہت شخصیت ہے۔ نہ صرف بہار بلکہ ہندوستان بھر میں اتنی رنگا رنگ صلاحیتوں کے مالک ادیب گنتی کے ہوں گے۔ وہ ایک مستند نگار تھے۔ ان کے پانچ افسانوی مجموعے شائع ہو چکے ہیں.....اردو افسانہ نگاری میں انہوں نے اپنی ایک علاحدہ پہچان قائم کی۔ ساتھ ہی ساتھ ان کا ناول "حسرتِ تعمیر" بھی ناول نگاری میں اہم اضافہ کی حیثیت رکھتا ہے.....اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے تنقید و تحقیق میں بھی اپنا ایک معیار اور انداز قائم کیا۔ تنقیدی مضامین کے مجموعے قدر و نظر، تحقیق و تنقید، مطالعہ اقبال، مطالعہ نظیر، سراج و منہاج، وغیرہ بہت شہرت رکھتے ہیں۔ تحقیقی مقالہ "بہار میں اردو زبان و ادب کا ارتقا" پر ڈی لٹ کی ڈگری حاصل ہوئی۔ یہ کتاب آج بھی مشہور و مقبول ہے۔ ان سب کے علاوہ اختر اورینوی کا نام بہار میں اردو ڈراما نگاری کے میدان میں بھی کسی سے پیچھے نہیں۔ (بہار میں اردو ڈراما نگاری: آزادی کے بعد، ص: 111-110، ناشر: سلسلہ، خانقاہ منعمیہ، میتن گھاٹ، پٹنہ)

مالک رام: اختر اورینوی نے اردو زبان کی جو بیش بہا خدمت کی ہے، وہ بھولنے کی چیز نہیں۔ ان کی پندرہ بیس کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ ان میں ایک "ڈراما" اور بیسیوں افسانے ہیں۔ ایک ناول بھی ہے۔ تنقیدی مضامین کے متعدد مجموعے ہیں۔ تحقیقی مقالے ہیں۔ شعری تخلیقات کا ایک (ایک نہیں بلکہ دو) مجموعہ ہے۔ غرض ہر صنفِ ادب میں ان کے کارنامے موجود ہیں۔ غیر مطبوعہ تحریریں بھی کچھ کم نہیں۔ ایسے خادمِ ادب اور مربیِ زبان کو کون بھلا بھول سکتا ہے۔ اختر بنیادی طور پر نظم کے شاعر ہیں۔ انہوں نے جس رنگ کی تعلیم پائی اور جس ماحول میں ان کی تربیت ہوئی، اس کے بعد وہ غزل کی گوں کے رہ بھی نہیں سکتے تھے۔ انہوں نے بعض معرکے کی رومانی نظمیں کہی ہیں، جو ان کے مجموعوں میں دیکھی جا سکتی ہیں۔

(تذکرہ معاصرین، جلد چہارم، ص: 236-235، ناشر: مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، نئی دہلی)

ڈاکٹر قیام نیّر: بہار میں جب بھی افسانہ نگاری کا ذکر ہوگا تو اختر اورینوی کا نام نہایت ادب و احترام سے لیا جائے گا۔ انہوں نے اردو افسانہ نگاری میں جو نام کمایا ہے اور افسانوی ادب کا جو سرمایہ چھوڑا ہے، وہ بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتا ہے۔ وہ بنیادی طور پر افسانہ نگار تھے، لیکن افسانہ نگاری کے ساتھ انہوں نے ڈراما، تنقید اور ناول وغیرہ بھی لکھے ہیں۔

(بہار میں تخلیقی نثر: آزادی کے بعد، ص: 117، مطبوعہ: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی)

روفیسر وہاب اشرفی: اختر اورینوی کی کئی ادبی جہتیں ہیں۔ وہ بیک وقت افسانہ نگار، ناول نگار، شاعر،

مقرر، پُر وقار استاد رہے ہیں..... بحیثیتِ افسانہ نگار اختر اور ینوی کا امتیاز بہت واضح اور روشن ہے۔ ان کے افسانے فکری پس منظر رکھتے ہیں، جن میں فلسفے کا بھی پٹ موجود ہے..... اختر اور ینوی کی ایک حیثیت نقاد کی بھی ہے اور یہ حیثیت محترم بھی ہے۔ انہوں نے چند ایسے مضامین بھی قلم بند کیے جو شعر و ادب کے مزاج و منہاج سے متعلق ہیں۔ لیکن ان کی بعض کتابوں یا مضامین کے مجموعوں میں بہار یعنی عظیم آباد کے ادبا و شعرا مرکزِ نگاہ رہے ہیں۔ اس لحاظ سے کہا جا سکتا ہے کہ دبستانِ عظیم آباد کے استحکام میں ان کی نگارشات بیحد اہم رہی ہیں۔ انہوں نے اس اسکول (دبستانِ عظیم آباد) کے خد و خال کے تعین کی بھی کوششیں کی ہیں۔ اس لحاظ سے بھی ان کا جذبہ اور ادب کی خدمت بیحد احترام کے لائق ہے۔ اختر اور ینوی کی ایک حیثیت محقق کی بھی ہے۔ انہوں نے بعض قدیم شعرا پر گراں قدر مضامین لکھے، جن میں اکثر کا تعلق بہار سے ہے۔ ان کے بعض نتائج سے اختلاف کیا جا سکتا ہے، لیکن تلاش و جستجو کے میلان سے نہیں۔ ان کے ڈی لٹ کے مقالہ "بہار میں اردو زبان و ادب کا ارتقا" کی ادبی اور تحقیقی اہمیت ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اس پر قاضی عبدالودود نے سینکڑوں عیوب اور تسامحات قائم کیے ہیں، لیکن ان امور کے باوجود اس مقالے کی اپنی اہمیت ہے اور عظیم آباد اسکول کے تعین میں اس سے مسلسل روشنی بہم پہنچتی رہی ہے۔ یہ ان کا ایسا امتیاز ہے جسے کسی لمحہ نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

(تاریخِ ادب اردو، جلد دوم، ص:973-972-971، ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی)

ڈاکٹر محمد اسرائیل رضا: بہار میں اردو تنقید کی خوش قسمتی ہے کہ اس کے بیشتر نام ور قلم کاروں نے طویل عمر پائی اور آزادی کے بعد چند سال نہیں بلکہ کئی کئی دہائیوں تک اپنے افکار و خیالات اور مطالعاتی و تجزیاتی عطریات سے جہانِ نقد و نظر کے مختلف گوشے منور کرتے رہے۔ اختر اور ینوی اور کلیم الدین احمد کی انتقادی تحریروں کا سلسلہ آزادی کے بعد برسہا برس جاری رہا۔ کلیم الدین احمد آزادی کے بعد تقریباً تیس برسوں تک اور اختر اور ینوی کم و بیش پچیس برسوں تک لکھتے رہے اور اردو تنقید کے ذخیروں کو باثروت بناتے رہے۔

(سالنامہ مجلہ اردو جرنل 2010، ص:111، ناشر: شعبہء اردو پٹنہ یونیورسٹی، پٹنہ)

محمد حسنین رضا: اختر اور ینوی ایک ہمہ گیر اور ہمہ جہت شخصیت کا نام ہے۔ جنھوں نے ادبی کارناموں کا ایک یادگار ذخیرہ چھوڑا ہے۔ اختر اور ینوی شاعر، افسانہ نگار، ڈراما نگار، ناول نگار، محقق اور ناقد بھی تھے۔ ادب کا کوئی ایسا گوشہ نہیں جہاں انھوں نے تصنیف و تالیف کی صورت میں خوب صورت موتی

نہ بکھیرے ہوں۔ ہر صنفِ ادب میں انھوں نے قلم کا زور دکھایا ہے۔ اختر اورینوی ایک پیدائشی ادیب تھے اور تخلیق کاری ان کی وہبی استعداد تھی۔ انھوں نے لکھا اور خوب لکھا اور ہر میدان میں اپنے فن کے جوہر دکھائے۔ وہ شاعر بھی اعلیٰ مقام کے تھے اور افسانہ نگار بھی منفرد تھے۔ ناول نگاری اور ڈراما نگاری میں بھی ان کی شخصیت قابل ستائش تھی اور بحیثیت ناقد و محقق بھی بلند پایہ تھے۔ اختر اورینوی نے اپنے تنقیدی مضامین و تصانیف میں تنقید کے بنیادی مسائل کی طرف لوگوں کی توجہ مبذول کرائی۔ (ماہنامہ اردو دنیا، دہلی، مارچ 2022)

☆☆☆

Tarvij-o-tashviq-e-tarikh Nigari Dar Ahd-e-Akbari by Md.Mahfooz Alam

(Research Scholar,dept. of Persian,Jamia Millia Islamia,New Delhi)

محمد محفوظ عالم (ریسرچ اسکالر، شعبہ فارسی، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی)

ترویج وتشویق تاریخ نگاری درعھد اکبری

تاریخ نگاری فارسی درھند سابقہ طولانی دارد اما پیش از آغاز اصل مطلب لازم می دانم تاریخچہ ای راجع بہ پیوند کشور ایران وھندوستان وورود زبان فارسی درشبہ قارہ ھند وتداول آن رابا ایجاز واختصار بہ خاطر عزیز خوانندگان بیاورم تامقصود بندہ بہ نحو احسن انتقال یابد۔ کشور ایران وھندوستان از زمان باستان بعنوان زبان وفرھنگ یکپارچگی داشتہ اند واین یکپارچگی ھموارہ باعث تعاطی زبان و فرھنگ شدہ است۔ ترجمہ شدن "پنجاتنترا" بہ زبان پھلوی ومقبول شدن درایران وترویج یافتن بازی "شطرنج" درایران از آن خاطرات دلپذیر است۔ گذشتہ ازین، حملات محمود غزنوی بہ ھند باعث ترویج زبان فارسی درھند شد۔ درین اوان ابوریحان البیرونی بہ ھند وارد شد وتامدتی آنجا قیام کرد۔ زبان وفرھنگ، عقاید و مذاھب، علوم وفنون، مراسم ومروجات ھندیان را با دقت مشاھدہ کرد و بہ کتاب معرکۃ الآرا بنام "تحقیق ماللھند" یا "کتاب الھند" تالیف کرد و برای ایرانیان و فارسی گویان درک کردن اوضاع جامعہ ھندرا آسان کرد۔

بدیھی است کہ تاریخ نویسی فارسی از ایران بہ ھندراہ یافتہ است ومورخان ایرانی وھندی کہ دردرزمان سلاطین دھلی درھند بودندتواریخ معتبر ومعروف ایرانی منجملہ تاریخ بیھقی، مجمل التواریخ، تاریخ گردیزی وغیرہ رادرنظر داشتند وھنگام تالیف از سبک شان پیروی ھم کردہ اند۔ دکتر خلیق احمد نظامی ھم براین اعتقاد دارد "تاریخ نگاری ھند چہ درسبک انشا چہ درمحتوای تاریخی ونگرش بہ مکتب تاریخ نگاری توصیفی، متاثر از تاریخ نگاری ایران است وعنوان می کند کہ فصاحت زبان فارسی بہ این نوع تاریخ نگاری کمک بسیار کردہ است۔ تقریبا تمام اقسام تاریخ مانند عمومی نظیر "تاریخ بلعمی" و "مجمل التواریخ" وتواریخ سلسلہ ای چون "تاریخ یمینی" و "تاریخ بیھقی" کہ درآن زمان درایران متداول بوددرھند نیز رایج گشت آثار مشابھی چون "طبقات ناصری" و "تاریخ مبارکشاھی" کہ از جملہ تواریخ

عمومی بودند و "تاریخ علایی" و "تاریخ فیروز شاهی" که در زمرہ تواریخ سلسلہ ای محسوب می شدند، نگاشتہ شدند۔، دکتر آفتاب اصغر براین باور است کہ مورخان اولیہ دورہ سلطنت دھلی مانند حسن نظامی و منھاج سراج جوزجانی، تحت تاثیر سنت تاریخ نویسی ایرانی قرار داشتند و باظھور مورخان بومی مانند ضیا الدین برنی مولف "تاریخ فیروز شاھی" یحیی سرھندی مولف "تاریخ مبارک شاھی"، و۔۔۔ تاریخ نویسی فارسی ھند در گزینش وقایع بہ تدریج راہ استقلال پیمود و تواریخ محلی برای خود جای ویژہ ای باز کرد امافن تاریخ نویسی برھمان سبک و سیاق سابق ادامہ یافت۔ اوج تاریخ نویسی فارسی در شبہ قارہ ھند، مربوط بہ دورہ مغولان است و در دورہ مغولان بالخصوص زمان فرمانروایی پادشاہ اکبر، تاریخ نویسی فارسی باتشویق پادشاہ بہ اوج رسید۔

تاریخ نگاری در دورہ اکبر: اغلب امپراطوران تیموری شبہ قارہ ھند مانند ایلخانیان و تیموریان ایران از میان ھمہ علوم وفنون بہ تاریخ و تاریخ نویسی متمایل بودند۔ پیش از اکبر پدرش ھمایون وجدش بابر بجھت عدم استحکام سلطنت نتوانستند مورخان را بہ دربار خود منسلک کنند و میراث اجداد خود را در ھند ادامہ بدھند۔ ولی اکبر فرصت وافر برای این کار پیدا کردہ بود۔ اگر چہ کم سواد بود ولی علاقہ خاصی بہ تاریخ داشت۔ مولف تاریخ فرشتہ درین بارہ می گوید: "اگر چہ سواد کامل نداشت اما گاھی شعر گفتی و در علم تاریخ وقوفی تمام داشت وقصص ھند نیکو میدانست'۔ "اکبر شاہ برای وسعت دادن و پر مایہ ساختن دامن تاریخ نویسی فارسی بسیار از اقدامت اساسی را بعمل آورد کہ یکی از آنھا بوجود آوردن منصب "مورخ درباری" است۔ غیر ازین برای جبران کمبود اطلاعات تاریخی در بارہ دورہ بابری وھمایونی نیز فکر اساسی کرد و بہ سال خوردگان و بازنشستگان و تربیت یافتگان عھد بابر و ھمایون مانند گلبدن بیگم، مھتر جوھر و بایزید بیات را دستور داد کہ خاطرات و یادداشتھای مربوط بہ دورہ پادشاھان مذکور را بصورت کتب تاریخی بہ رشتہ تحریر در آورند'۔ مختصر اینکہ جھت تشویق و ترویج نویسندگان و مورخان، تاریخ نویسی این دورہ باوج کمال رسید و اعقاب بادشاہ اکبر ھم برین سنت گامزن بودند۔

تواریخ دورہ اکبری۔ **تاریخ خاندان تیموریہ:** موضوع این تاریخ از نامش مبین است کہ تاریخ خصوصی خاندان تیموریہ، امیر تیمور و اخلافش کہ در آسیای مرکزی فرمانروایی می کردند۔ علاوہ برین، تاریخ تیموریان ھند ھم مذکور است و در حدود 984 ھجری تالیف شدہ است۔ مولف این کتاب ناشناس است۔ این تاریخ شامل یک مقدمہ بودہ ولی قسمتی از آن از میان رفتہ است۔ بقول دکتر آفتاب اصغر " آنچہ کہ در مورد تاریخ بابر و سلطان حسین میرزا و شرح احوال دانشمندان و ادبای بزرگ در باروی نوشتہ

غالبا منقول و ماخوذ از واقعات بابری تالیف بابرشاه میباشد۔ البته وقایع وحوادث زمان همایون و اکبر را براساس مشاهدات شخصی خود نوشته است۔

تاریخ اکبری: محمد عارف قندهاری در دستگاه بیرم خان بود وسمت میر سامان را داشته و در سفر و حضر همراهش بود۔ الغرض، فعالیت های سیاسی دوره همایون و اکبر را از نزدیکی مشاهده کرده بود۔ وتاریخی بنام تاریخ اکبری تالیف کرد که سه قسمت مشخصی دارد. این کتاب حاوی اطلاعات با ارزشی از زمان شاهزادگی وحوادث نیمه اول دوران سلطنت اکبرشاه است۔ از جهت سبک انشا از متون عمده ادب فارسی است ونثری بسیار متین واستوار بالحن شیرین دارد و بعنوان معتبرترین منابع دوره اکبری محسوب میشود۔

تحفه اکبرشاهی یا تاریخ شیرشاهی: تحفه اکبرشاهی کتابی است که یک نفر افغان بنام عباس خان سروانی در ۹۹۴ هجری تالیف کرده است۔ این کتاب مشتمل بر سه طبقه بود ولی الان فقط آخرین طبقه موجود است که احوال زندگانی شیرشاه سوری را احاطه می کند۔ این کتاب سه باب دارد که تفصیل آن طبق ذیل است:"" باب اول: درذکر احوال سلطنت شیرخان سور۔ باب دوم: درذکر احوال سلطنت اسلام خان بن شیرشاه سور۔ باب سوم: درذکر احوال ملوکی که از خویشان ومتعلقان شیرخان بودند وبعد از اسلام خان دعوی سلطنت نمودند وسکه وخطبه بنام خود فرمودند وپسر اسلام خان را از سلطنت عزل نمودند۔

تاریخ گجرات: میر ابوتراب گجراتی در سال 994 هجری قمری تاریخ محلی گجرات بنام تاریخ گجرات تالیف کرد۔ مقدمه وتمهید این کتاب ضایع شده است۔ مطالب این کتاب را می توان در دو فصل تقسیم کرد۔ اول تاریخ بهادرشاه وجنگهای وی با همایون پادشاه، دوم جنگهای بادشاه اکبر با اخلافش۔ سبک نویسندگی تاریخ گجرات حیث متانت انشا یکی از متون گرانبها تاریخ شبه قاره هنداست۔ مولف سراسر این کتاب سعی کرده است تا مطالب را با اختصار بیان نماید۔ ارزش کتاب نامبرده زین روافزایش می یابد که درقرن شانزدهم میلادی مولف روابط گجرات با مناطق شمالی هند بالخصوص با آگره ودهلی را سپرد قرطاس کرده است۔ باین علت تاریخ گجرات حلقه منابع اساسی ومعتبر تاریخ گجرات قرار میگیرد۔

تاریخ الفی: درزمان فرمانروایی اکبر از بعثت پیامبر اعظم صلی اللہ علیہ وسلم، هزار سال شده بود وچنانکه قبلا متذکر شدیم که بادشاه اکبر به تاریخ نویسی علاقه فوق العاده ای داشت واقدامات اساسی برای تاریخ نویسی بعمل درآورده بود، لذا به فرهنگان عصر دستور دادتا تاریخی بنویسند که احوال هزار ساله را احاطه کند۔ درتدوین این کتاب ضخیم مورخان هندی وایرانی مخجمله ملا احمد تتوی، آصف خان قزوینی، نقیب

خان قزوینی، میر فتح اللہ شیرازی، نظام الدین ھروی، عبدالقادر بدایونی، حکیم علی گیلانی، حکیم ھمام گیلانی و ابراھیم سرھندی وغیرہ سھیم بودند۔ دراین کتاب عظیم حداث عالم اسلام از رحلت پیغمبر اکرم (۱۱ ھجری) تا 1000 ھجری با شمول تاریخ عربستان، ایران، ھندوستان، آسیای صغیر، آفریقای شمالی، و دیگر کشورھای اسلامی میباشد۔ تاریخ الفی در سہ جلد منقسم میشود کہ مشتمل برتواریخ گونا گونی ھستند۔

جلد اول: از رحلت پیغمبر اکرم (۱۱ ھجری) تا انقراض امویان

جلد دوم: از روی کار آمدن عباسیان (132 ھجری) تا تاجگذاری غازان خان

جلد سوم: از آغاز سلطنت تا غازان تا سی و ھفتمین سال جلوس اکبر شاہ۔

مجامع الاخبار: این کتاب بنام "تاریخ محمد شریف وقوعی" ھم معروف است۔ میر محمد شریف وقوعی یکی از خانوادہ سادات نیشاپور بود۔ شھرت سخاوت عبدالرحیم خانخانان شنیدہ بہ دربار وی رسید و در سال 1000 ھجری مجامع الاخبار را در شھر آگرہ تالیف کرد۔ مجامع الاخبار تاریخ اجمالی عالم است کہ از روز ازل تا احوال زمان مولف را احاطہ می کند۔ مولف در مقدمہ این کتاب دو مقالہ افزودہ است۔ مقالہ اول در بارہ فواید تاریخ، آغاز آفرینش، تاریخ انبیا و تاریخ پادشاھان یھود می باشد و مقالہ دوم در بارہ احوال پیغبر اعظم محمد صلی اللہ علیہ وسلم، خلفای راشدین، خلفای بنی امیہ، بنی عباس و بنی فاطمہ میباشد۔ بعد ازین تاریخ ایران، تاریخ مغولان، صفویان و عثمانیان را در معرض تحریر آوردہ است۔ تاریخ ھند کہ درین کتاب مذکور است در سہ باب منقسم میشود۔ باب اول از سلطان سبکتگین تا انقراض سلسلہ سادات و تاریخ سلسلہ ھای محلی ھند مانند مظفریان، بھمنیان، و خلجیان مالوہ و افاغنہ جونپور و بنگالہ۔ باب دوم در بارہ سلسلہ لودیان از آغاز تا پایان، باب سوم احوال تیموریان ھند از بابر تا سی و ھفتمین جلوس اکبر ۱۰۰۰ ھجری) را احاطہ می کند۔

طبقات اکبری: خواجہ نظام الدین احمد در سال 1002 ھجری تاریخ برجستہ ای بنام طبقات اکبری نوشت کہ مشعل راہ برای مورخان خلف قرار گرفت حتی مورخان ھمعصر نظام الدین احمد مانند ملا عبدالقادر بدایونی ھم ازین کتاب پرارزش بسیار استفادہ کردہ اند۔ ویژگی طبقات اکبری اینست کہ مولف اولین مورخ است کہ در عھد تیموریان نخستین تاریخ مدون در بارہ سلاطین مسلمان ھندوستان است کہ بروش جدید و براساس فنی تدوین شدہ است۔ این کتاب مشتمل بر سہ جلد است۔ جلد اول احوال سلاطین قبل از تیموریان ھند را بھم می رساند۔ جلد دوم احوال تیموریان ھند از بابر تا پایان سی و ھشتمین سال جلوس اکبر را بھم می رساند۔ آخرین جلد احوال سلسلہ ھای محلی ھند را بھم می رساند۔

منتخب التواریخ یا تاریخ بدایونی: ملا عبدالقادر بدایونی یکی از برجستہ ترین مورخین دورہ اکبری است کہ درسال 1004 ھجری قمری ارزندترین اثر خود را بہ تالیف رسانید۔ این کتاب مشتمل بر سہ جلد میباشد جلد اول احوال سلاطین دھلی را تا زمان ھمایون پادشاہ بھم می رساند وجلد دوم مشتمل بر اوضاع واحوال فرمانروایی اکبر است۔ سومین جلد مختص بہ احوال شاعران، نویسندگان و عارفان نامی عصر مولف است۔ بیشتر از مطالب جلد اول ودوم این کتاب از طبقات اکبری نظام الدین احمد ماخوذ ند۔ نقطہ مھمی این کتاب لحن انتقادی مولف است کہ منتخب التواریخ را از دیگر تواریخ معاصر ممتاز می سازد۔ عبدالقادر بدایونی مرد مذھبی بود وجابہ جابہ عقاید بادشاہ اکبر اعتراض وانتقاد کردہ است کہ در دیگر تواریخ کہ معمولا در دربار نوشتہ می شدند، یافتہ نمیشود۔ مثلا وقتیکہ اکبر دین الٰھی را بہ وجود آورد کہ علیہ عقاید اسلام بود۔ بدایونی بر آن نقد کنان بادشاہ جلال الدین اکبر را "ضلال دین اکفر" گفتہ است۔ چنین جرات در تاریخ نویسی از ھیچ مورخی این دورہ بر نیامدہ است۔

قبلا ذکر کردیم کہ اکبر دستور عام دادہ بود کہ ھر کسی کہ خاطرات واقعات دورہ بابر وھمایون را دارد بہ دربار رجوع کند یا جمع کردہ بہ مورخان بسپارد۔ درھمین دورہ بدایونی ھم مخفیانہ تالیف کردن این کتاب آغاز کرد ودر زمان فرمانروایی بادشاہ جھانگیر (دہ سال بعد از مرگ اکبر) منتشر کرد۔ بہ نظر بندہ بعد از تاریخ فیروز شاھی این اولین کتاب است کہ باصدق تمام وبدون تملق بہ تالیف رسیدہ است کہ جنبہ ھای منفی سیاست دورہ اکبری را با لحن انتقادی تقدیم خوانندگان می کند۔ با وجود توقیف و امتناع شاھی، این کتاب در ھر دورہ یکی از پر فروشترین ومقبولترین تاریخ بودہ است۔

تاریخ حقی: این کتاب بنام ذکر الملوک، تذکرۃ السلاطین وتاریخ پادشاھان ھند نیز شھرت دارد۔ این کتاب مشمل است بر تاریخ ھند از شھاب الدین محمد غوری (602-569-ھجری) تا چھل ودومین سال سلطنت اکبر (1005 ھجری) و در سال 1005 ھجری بہ تالیف رسیدہ است۔ شیخ عبدالحق محدث دھلوی این کتاب را بہ سبک طبقات اکبری نوشتہ است۔ از لحاظ موضوع این کتاب در دو باب منقسم میشود۔ باب اول شامل احوال سلاطین دھلی است و باب دوم شامل احوال سلاطین مسلمان خارج از دھلی است۔

تاریخ سندھ: بعد از چچ نامہ اولین کتاب است کہ در بارہ تاریخ سند نوشتہ شد۔ میر معصوم بھکری در سال 1009 ھجری این تاریخ را بہ پایان رسانیدہ و کتاب مذکور بنام تاریخ معصومی ھم شھرت دارد۔ موضوع اساسی این کتاب تاریخ محلی سند از زمان حملہ محمد بن قاسم تا عھد اکبر شاہ است۔ بمزید، این

کتاب در چهار بخش منقسم است۔ بخش اول مربوط به وقایع فتح سند بدست محمد بن قاسم، بخش دوم مربوط به اوضاع سند در زمان غزنویان وغوریان، بخش سوم مربوط به تاریخ سلسله سلاطین با استقلال ارغونیه و بخش چهارم مربوط بر وقایع متصرف شدن سند بدست تیموریان هند۔

اکبرنامہ: ارزندہ ترین تاریخ دورہ اکبری است کہ بدست شیخ ابوالفضل علامی بہ زیور تحریر در آوردہ شد۔ این کتاب تاریخ سلسلہ تیموریان هند تا چهل و هشتمین سال جلوس بادشاہ اکبر را بہ طور مفصل بهم می رساند۔ در گرد آوری این کتاب ابوالفضل بسیار مشقت کشیدہ بود وعملہ شاهی هم برای فراهم آوردن مطالب مقصور مامور بودند۔ ابوالفضل با منابع معتبر تاریخ تیموریان و اشخاص معتبر مانند گلبدن بیگم، جوهر آفتابچی، بایزید بیات وغیرہ برای جمع آوردی اطلاعات استفادہ کردو تا آنوقت تاریخ تیموریان هند کہ پراکندہ بود، در کتاب اکبرنامہ جمع کرد۔

آیین اکبری بعنوان دفتر چهارم این کتاب محسوب میشود کہ با حیثیت دارالمعارف دورہ اکبری برخوردار است۔ این دفتر بہ علت مرگ ناگهانی ابوالفضل ناتمام ماندہ است ولی هنوز اطلاعات وافر بہ دست ما می رساند۔ این کتاب اطلاعات اداری، نظامی، اقتصادی، مذهبی واجتماعی دورہ اکبر را شرح می دهد۔ نثر اکبرنامہ بسیار غنی ومملو با استعارات وکنایات است۔ بہ علت سبک بی نظیر وعدیم المثال، اکبرنامہ نہ فقط باارزش تاریخ بلکہ باارزش ادبی هم برخوردار است۔ در بارہ این کتاب می توان گفت کہ برای اطلاعات دورہ اکبری فقط رجوع بہ اکبرنامہ کافی است۔

تاریخ اکبرشاهی: شیخ اللہ داد فیضی سرهندی تاریخ نامبردہ را در سال 1010 هجری بہ تالیف رسانید کہ تاریخ خصوصی دورہ اکبر است۔ از سبک نویسندگی برمی آید کہ مولف سبک نگارش اکبرنامہ را تقلید نمودہ است ومندرجات کتاب در بہ طرز سالنامہ درجہ بندی کردہ است۔ وهر فصل شرح وقایع وحوادث یکسال سلطنت اکبرشاہ را در بردارد۔

زبدۃ التواریخ: نورالحق دهلوی فرزند شیخ عبدالحق محدث دهلوی در سال 1014 هجری تاریخ عمومی هند اسلامی بنام زبدۃ التواریخ نوشت۔ این کتاب اصلا دنبالہ تاریخ حقی کہ مولفہ پدرش است، می باشد۔ فرق میان هردو این است کہ تاریخ حقی خیلی مختصر بود وزبدۃ التواریخ مفصل است۔ بمزید، کمی وکاستی کہ در تاریخ حقی بہ جا ماندہ بود، نورالحق دهلوی آنرا رفع کردہ مطالب مفید را اضافہ نمودہ است۔

اوضاع سیاسی وادبی دورہ بادشاہ اکبر: در روزگار سرگردانی همایون بادختری ایرانی بنام حمیدہ بانو بیگم کہ بہ گفتہ خوافی خان نسبش بہ شیخ احمد جام زندہ پیل می رسد، ازدواج کرد۔ در سال ۹۴۹ هجری در امرکوت

اکبر تولد یافت۔ تولد اکبر و دوران کودکی وی مصادف با بحران ھای سیاسی در قلمروی تیموریان بود۔

پدرش در ایران: پناھگزین بود و برادرش کامران میرزا علیہ وی فتنہ انگیزی می کرد۔ پس از چندین شاہ طھماسپ لشکر عظیم ھمراہ ھمایون فرستاد و ھمایون مجددا ھندرا فتح کرد۔ اکبر ھنوز چھاردہ سالہ نبود کہ پدرش بہ سبب افتادن از پشت بام کتابخانہ درگذشت و اکبر درخوردسالگی در سال 1556 میلادی جانشین پدر خود قرار گرفت۔ ازین لحاظ اکبر با احوال جدش بابر خیلی شباھت دارد۔ بابر ھم درخردسالگی در ھمچنین اوضاع بہ تخت سلطنت نشستہ بود۔

اکبر وارث دولتی شد کہ ھنوز استحکام نیافتہ بود معھذا دشمنان وشورش گران بسیار از چھار جانب آمادہ حملہ بودند۔ تجربہ بیرم خان درمیدان کارزار درحق سپاھان مغولان کارگر واقع شد و در جنگ دوم پانی پت لشکر اکبر بر ھیمو بقال فاتح گردید و بار دیگر پای مغولان در ھندریشہ گرفتن آغاز کرد۔ بیرم خان تا پنج سال از حیث اتالیق بادشاہ اکبر مامور بود۔ دراین زمان گوالیار، جونپور، اجمیر، بنارس و مالوا مفتوح شد۔ بسبب دسیسہ کاری، بادشاہ اکبر وی را فرمان سپری شدن داد و برای زیارت بیت اللہ فرستاد ولی درمیان راہ در سال 1561 میلادی کشتہ شد۔

بعد از مرگ بیرام خان، اکبر بدون اتالیق فرمانروایی آغاز کرد بہ تسخیر مالوہ متوجہ شد۔ بعد از فراغت، متوجہ فرو کردن شورش داخلی شد و سرد کردگان تیموریان و ازبکان را مطیع ساخت۔ تا سال 975 ھجری موفق گردید تا کہ درسرتاسر مملکت امنیت و آرامش برقرار سازد و با خیال راحت بہ تسخیر بلاد دیگر متوجہ شود۔ در سالھای متمادی اکبر بہ مطیع گردانیدن راجپوتان توجہ خود را مرکوز کرد و چتور، رنتھمبور و کالنجر را فتح کرد۔ پس ازین بہ ممالک موروثی خود کہ درزمان بابر و ھمایون جزو قلمروی مغولان بود، توجہ کرد و سال 941 ھجری گجرات مفتوح شد۔ راجہ تودرمل را بہ تسخیر بنگالہ فرستادہ شد و افغانان کہ آنجا فرمانروایی می کردند با شکست فاحشی روبرو شدند۔ بعد ازین لشکر مغولان بہ جانب ولایت کشمیر رخ کرد و در 995 ھجری کشمیر ھم شامل قلمرو گشت۔ بعد از فتوحات پیاپی اکبر دستور داد تا سند و قندھار را شامل قلمرو گردانند کہ درزمان بادشاہ بابر زیر تصرف مغولان بود۔ در سال 1002 ھجری سند و در 1004 ھجری قندھار مفتوح شد۔

از شمال فراغت یافتہ، اکبر متوجہ دکن شد و تحت فرماندھی عبدالرحیم خانخانان، شیخ ابوالفضل، شاھزادہ مراد، و شاھزادہ دانیال در مدت کوتاھی احمدنگر، برار، خاندیش، اسیر گرہ ضمیمہ متصرفات تیموری گشت۔ بادشاہ اکبر تا پنجاہ سال فرمانروایی کرد و در زمان وی قلمروی مغولان در شمال تا قندھار، در غرب تا

احمد نگر، در شرق تا بنگالہ گسترده بود۔ بعد از او فقط اورنگزیب توانسته تا قلمروی مغولان را وسیعتر کند۔ در سال 1014 هجری اکبر ازین دار فانی به دار جاویدانی کوچ کرد۔ در قرن شانزدهم میلادی سه تا امپراطوری بزرگ منجمله عثمانیان ترکی، صفویان ایران و تیموریان هند در آسیا فرمانروایی می کردند۔ صفویان شیعه متعصب بودند در ایران از سرپرستی شاعران قصیده دست برداشتند وتعداد بزرگی ارباب کمال بی نوا شدند۔ اینجا اکبر سلطنت خود را استحکام بخشیده دروازه دربار معلّی بر مستعدان ادب باز کرد و در نتیجه مستعدان ادب منجمله غزالی مشهدی، عرفی شیرازی، نظیری نیشاپوری، شکیبی، ظهوری، محتشم کاشی، خواجه حسین مروی، ثنایی مشهدی، میلی هروی، نوری، حیاتی گیلانی، طالب اصفهانی، اسد بیگ وغیره، که در ایران دچار بانابسامانی بودند، رخ به هندوستان کردند۔ چون تعداد شاعران زیاد شد، اکبر سنت ملک الشعرایی را در هند مروج گردانید و غزالی مشهدی اولین ملک الشعرای هند قرار گرفت و پس از مرگ وی فیضی فیاضی برادر شیخ ابوالفضل دومین ملک الشعرای دربار اکبر قرار یافت۔

اکبر "دارالعبادت" را بنیان نهاد که آنجا پیروان مذاهب مختلف جمع می شدند و مباحثه و مناظره می کردند۔ اکبر هنگام فرصت در آن مباحثات حاضر میشد و بعد از شنیدن مباحثات رهبران مذاهب مختلف برین باور شد که اصل همه مذهب یکی است۔ این نقطه را در نظر داشته دین جدید بنام "دین الٰهی" به وجود آورد و تعدادی از اقربای وی مقلد دین جدید شدند۔ ملا عبدالقادر بدایونی در منتخب التواریخ به ضمن دین الٰهی بادشاه اکبر را مورد انتقاد قرار داده و بنام "ضلال دین اکفر" یاد کرده است۔

اکبر به دانشمندان و نویسندگان دستور داد تا شاهکارهای ادبیات زبانهای مختلف از قبیل سانسکریت، عربی، ترکی و حتی لاتینی را به زبان فارسی ترجمه کنند۔ کتابهای معروف بدستور اکبر به زبان فارسی ترجمه شده اند عبارت اند از مهابهارت، رامایین، سنگاسن بتیسی، حیوت الحیوان، اتهربن، انجیل، تزک بابری، لیلاوتی، تاجک، هربنس، معجم البلدان، راج ترنگنی، نل و دمن، جامع رشیدی، بحر الاسمار، نزهت الارواح وغیره۔ ابوالفضل کلیله ودمنه را به زبان ساده بنام "عیار دانش" برگردانده بود۔

نتیجه گیری: دوره اکبری به خاطر کثرت نویسندگان، سخنوران و مترجمان مانند میر فتح الله شیرازی، ابوالفتح گیلانی، نقیب خان، حکیم همام، نظام الدین احمد، مولانا احمد تتوی، آصف خان قزوینی، ابراهیم سرهندی، قاضی نورالله شوستری، خواجه حسین مروی، ثنایی مشهدی، حیاتی گیلانی، میر معصوم بهکری، وقوعی نیشاپوری، سرمدی اصفهانی وغیره، خیلی ممتاز بود۔ حتی امرای معروف مانند عبدالرحیم خانخانان، حکیم ابوالفتح گیلانی، شیخ ابوالفضل وغیره هم دربار جداگانه داشتند و سرپرستی شاعران و سخنوران می کردند۔ مختصر

اینکہ دورہ اکبری در تاریخ ادبی وفرھنگی شبہ قارہ ھند بیش از اخلاف ارزش واھمیت دارد۔ پیش از دورہ اکبری تواریخ فارسی مانند تاج المآثر، طبقات ناصری وتاریخ فیروز شاھی درمعرض تحریر آمدہ بودند ولی تواریخ فارسی پیش از دورہ اکبری زیاد توجہ نداشت۔ یکی از مزایای تواریخ دورہ اکبری این ھم است کہ متنوع الموضوع ھستند۔ بیوگرافی یا تاریخی کہ بر ترجمہ رجال مشتمل میباشد، دراین دورہ بسیار ترویج یافت وحالات آصف خانان، احوال میر عطااللہ از شیخ نورالحق مشرقی، واقعات مشتاقی از شیخ رزق اللہ دھلوی وغیرہ از نمونہ آنھا ھستند۔

درتاریخ نویسی فارسی آسیای میانہ وآسیای شرقی می بینیم کہ تواریخ منظوم ھم نوشتہ میشد ودر ھند مثنویات امیر خسرو دھلوی مخملہ قران السعدین، مفتاح الفتوح، نہ سپھر وغیرہ نمونہ تاریخ منظوم ھند ھستند۔ ھمایون نامہ وظفر نامہ احمد آباد از ابوالفیض فیضی از جملہ تواریخ منظوم دورہ اکبری ھستند۔ درین دورہ تواریخ مذھبی ھم سپرد قلم شدہ اند کہ عبارت انداز تواریخ این دورہ مغازی النبی از شیخ یعقوب صرفی کشمیری، جذب القلوب الی دیار المحبوب از شیخ عبدالحق محدث دھلوی، مدارج النبوہ ودرجات الفتوہ از محدث دھلوی۔ تواریخی کہ اززبان دیگر بہ فارسی ترجمہ شدہ اند عبارت انداز تاریخ کشمیر از محمد شاہ آبادی (ترجمہ راج ترنگنی)، ترجمہ فارسی راماین، رزم نامہ ترجمہ مھا بھارت۔

منابع:

۱۔اصغر، آفتاب، تاریخ نویسی در ھند وپاکستان، خانہ فرھنگ ایران، لاھور، پاکستان، ۱۳۶۳ ھجری۔

۲۔بدایونی، ملا عبدالقادر، منتخب التواریخ، مترجم علیم اشرف خان، قومی کونسل برای فروغ اردو زبان، نءدھلی، ۲۰۰۸م

۳۔علامی، ابوالفضل، اکبرنامہ، ایشیاتیک سوسایتی، کلکتہ، ۱۸۷۷م

۴۔عبدالرحمن، سید صباح الدین، بزم تیموریہ، مطبوعہ معارف اعظم گر، ۱۹۸۱م

۵۔فرشتہ، محمد قاسم ھندوشاہ، تاریخ فرشتہ، نولکشور پریس، لکنو ۱۹۰۵م

1:Chandra, Satish, History of Medieval India, Revised Edition, Orient BlackSwan, Pvt. New Delhi, 2020

2:Nizami, Khalid Ahmad, On History and Historians of Medieval India, Munshiram Manoharlal, New 1Delhi, 1983

☆☆☆

Dr.Mohd. Mustamir ka adabi safar : Tanqeed se fiction tak by Dr. Rafique Ahmad(dept. of Urdu, D.C.S.K.(P.G.) college Mau

ڈاکٹر رفیق احمد (شعبہء اردو، ڈی۔سی۔ایس۔کے۔پی جی کالج، مئو) cell-9236126977

ڈاکٹر محمد مستمر کا ادبی سفر تنقید سے فکشن تک

تقریباً دو دہائی قبل اور ۲۰۰ء کے بعد پیدا ہونے والے اردو کے اہم افسانہ نگاروں میں ایک منفرد اور نمایاں نام ڈاکٹر محمد مستمر کا ہے آپ اردو کے ایسے نمائندہ ترین فکشن نگار ہیں جن کے افسانوں میں حالاتِ حاضرہ کی صحیح ترجمانی وعکاسی بہترین انداز میں کی گئی ہے، ایک درجن کتابوں کے مصنف ڈاکٹر محمد مستمر کی علمی وادبی شخصیت ابھی محتاج تعارف ہے آپ ایک ایسے کثیر الجہات فنکار ہیں جن کی ناقدانہ علمی بصیرت پر خصوصی توجہ دینے کی ضرورت ہے، ان کی ٹھوس اور مثبت تنقیدیں اہل بصیرت کو بہت جلدی اپنی طرف مائل کرتی ہیں اور اپنا گرویدہ بنالیتی ہیں۔

موجودہ دور میں نفسیاتی تنقید کے حوالے سے اگر بات کی جائے تو اس فن کو ترقی دینے والوں کی فہرست میں ڈاکٹر محمد مستمر کا نام بہر حال قابل ذکر ہے جنہوں نے اپنی تحریروں میں نفسیاتی تنقید کے مسائل کو بڑی باریک بینی سے برتنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔آپ کے تنقیدی مضامین کا پہلا مجموعہ ''تنقیص وتقریظ'' کے نام سے ۲۰۱۵ء میں شائع ہوکر مقبول خاص وعام ہو چکا ہے، تنقیدی تحریروں کا دوسرا مجموعہ ''پہلو در پہلو'' کے نام ۲۰۱۹ء میں قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، نئی دہلی کے مالی تعاون سے شائع ہوا ہے۔ان دونوں مجموعوں سے پہلے محمد مستمر کا تنقید وتحقیق کے حوالے سے بہت جامع ومدلل کتاب بعنوان ''علیم اختر مظفرنگری کی شاعری: ایک مطالعہ'' ۲۰۱۰ میں منظر عام پر آکر ادبی حلقوں میں مقبول ہو چکی۔حقیقت تو یہ ہے کہ اپنی پہلی مذکورہ تحقیقی وتنقیدی کتاب سے ہی محمد مستمر تنقید کے میدان میں اپنی شناخت بنا چکے ہیں۔ان کا یہ ایم فل کا مقالہ ہے جو کم وبیش ڈھائی سو صفحات پر مشتمل ہے، اپنے آپ میں کسی پی ایچ ڈی کے مقالے سے کم نہیں ہے۔صرف ضخامت کے لحاظ سے نہیں بلکہ مواد اور تحقیقی کے فن کے اعتبار سے بھی۔اس کتاب پر مشہور ترقی پسند نقاد علی احمد فاطمی کا پیش لفظ شامل ہے۔اس مقالے کے تعلق سے 'دعائیہ' عنوان کے تحت وہ فرماتے ہیں:

''مستمر صاحب نے ایم فل کا یہ مقالہ محض خانہ پری تک ہی محدود نہیں رکھا بلکہ کتاب کو پڑھنے پر اندازہ ہوتا ہے کہ موصوف نے بڑی محنت لگن اور غیر جانب داری سے تحقیق وتنقید کا حق ادا کیا ہے۔ انہوں نے نہ صرف علیم صاحب کی شعری جہتوں کو منکشف کیا ہے بلکہ ان کی نثر نگاری پر بھی سیر حاصل گفتگو کی ہے۔ مستمر صاحب نے صرف تنقید کے مختلف دبستانوں کے تحت اپنے نظریات قائم نہیں کیے بلکہ ان کا تنقیدی شعور کہیں جمالیاتی ہو جاتا ہے کہیں رومانی، کہیں نفسیاتی اور کہیں سائنٹفک۔ لیکن جب وہ جذبات سے کام لیتے ہیں تو بعض جگہ تنقید پر تعریف بھی غالب آجاتی ہے۔ مقالہ پانچ ابواب پر مشتمل ہے مقالہ کا دوسرا باب ''علیم اختر کا عہد اور معاصرین شعرا سے تقابل'' میں مصنف نے علیم اختر کے کلام کا معاصرین شعرا سے جو تقابلی جائزہ لیا ہے اس سے موازنہ انیس و دبیر' کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ اس کتاب کے لیے مقالہ نگار مبارک باد کے مستحق ہیں اور امید کی جاتی ہے کہ موصوف مستقبل میں تحقیق وتنقید کے میدان میں اگر اسی طرح انہماک سے لگے رہے تو نئے نئے باب وا کریں گے۔''

(علیم اختر مظفر نگری کی شاعری: ایک مطالعہ، ص: ۱۲۔ ۱۳)

'' پہلو در پہلو'' ۳۵۰ صفحات پر مشتمل اس تنقیدی کتاب میں متفرق موضوعات پر ۱۸ تنقیدی مضامین شامل ہیں جن میں خاص طور سے ''اکیسویں صدی میں غزل کے تیور، اردو غزل میں ہندوستانی عناصر، نظم نگاری میں خواتین کا حصہ، انیسؔ انصاری کے غزلیہ رموز و نکات، عطاؔ عابدی کے غزلیہ رجحانات اور نیازؔ جیراج پوری اپنے فن کے آئینہ میں'' انتہائی اہم اور قابل ذکر ہیں۔ ڈاکٹر محمد مستمر کی عالمانہ تنقیدی بصیرت کا اعتراف بڑی صدق دلی سے انور ایوبی گنگوہی نے ان الفاظ میں کیا ہے:

''ڈاکٹر مستمر کی تنقیدی تحریریں عام فہم ہوتی ہیں، ان کی طرز نگارش نہایت شگفتہ اور شستہ ہے، پڑھتے ہوئے بوریت نہیں ہوتی بلکہ تجسسانہ روح قائم رہتی ہے، انہیں لفظوں سے مصوری اور جادوگری کا ہنر بخوبی آتا ہے وہ اپنے بیانیہ میں الفاظ کی ایک وسیع کائنات زیر نگیں رکھتے ہیں اور قاری کو لسانی آگہی دیتے رہتے ہیں، مستمر کا تنقیدی رویے میں رومانیاتی و جمالیاتی عنصر بھی تحلیل ہوتا ہے مگر ان کے فن پارہ میں نفسیاتی پہلو جلوہ گر ہوتے ہیں، ان کی تحریریں نفسیاتی پہلو کی نشاندہی کرتی نظر آتی ہیں نیز وہ ترقی یافتہ وجدان وشعور سے مرصع نظر آتے ہیں، بلا مبالغہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ بڑے اعتماد کے ساتھ اپنے تنقیدی سفر پر رواں دواں ہیں، وہ ایک معتبر نفسیاتی تنقید کی تبلیغ کی طرف یقین واعتبار کے ساتھ گامزن ہیں، ان کے یہاں تنقیدی لطافتوں کی پاسداری، غنائیت اور نفسیاتی تخصیص نمایاں ہے، وہ تخلیق کو اپنی مشاہداتی نگاہوں سے دیکھتے ہیں جس کی وجہ یہ ہے کہ موصوف کا مطالعہ ومشاہدہ بلیغ و

بسیط ہے نیز تحقیقی شعور زندہ و بالیدہ ہے''۔

(پہلو در پہلو۔ڈاکٹر محمد مستمر، مطبوعہ آل انڈیا تعلیم گھر، لکھنؤ ۲۰۱۹ء ص ۲۳)

حقیقت یہ ہے ڈاکٹر محمد مستمر جس موضوع پر قلم اٹھاتے ہیں اس کی تہہ تک قارئین کو اپنے منفرد نفسیاتی اسلوب میں اس کی سیر کراتے ہیں، طرزِ تحریر میں روانی اور شگفتگی کا عنصر غالب رہتا ہے ان کی عالمانہ تنقیدی تحریریں بلاشبہہ اس قابل ہیں کہ اس کی جانب ہمارے عہد کے ناقدین فن کو خصوصی توجہ دینے کی ضرورت ہے تاکہ منفرد اسلوب کے اس نفسیاتی تنقید نگار کی حوصلہ افزائی بھی ہو اور ان کی ناقدانہ علمی و فنی بصیرت کا اعتراف بھی امید ہے کہ اس جانب عصرِ حاضر کے تدریسی نقاد ضرور توجہ دیں گے۔ موصوف کی تنقیدی بصیرت کا اعتراف کرتے ہوئے موجودہ دور کے نامور ادیب و دانشور پروفیسر طارق سعید لکھتے ہیں:

''ڈاکٹر محمد مستمر کا مجموعۂ مضامین ''تنقیص و تقریظ'' کا عنوان ہی علمِ نفسیات کے رمزوں سے آشکارا کرنے کے لئے کافی ہے، مجھے خوشی ہے کہ ڈاکٹر محمد مستمر نے علم نفسیات کا جبر الٹر عبور کیا ہے، اس مجموعہ کے بہانے ان کی یہ تنقیدی کاوش طلبہ اور اساتذہ دونوں کے لئے سودمند ثابت ہوگی، ایسی مجھے امید ہے، ڈاکٹر محمد مستمر کا استقلال اور استقامت یقیناً انہیں ایک دن معتبر نفسیاتی تنقید کی فہرست میں ان شاء اللہ لا کھڑا کردے گا، ایسا میرا قیاس ہے، اور یہ قیاس یوں ہی نہیں ہے بلکہ نفس کی شناخت میں تنقیدی متانت کے ساتھ امورِ خانہ شعور کی کارفرمائی نیز قوتِ استدلال کا مظاہرہ کسی بھی بالغ نظر کو یہ کہنے پر مجبور کرتا ہے کہ ڈاکٹر محمد مستمر کا مستقبل خوش آئند ہے اور تازہ واردِ بساط تنقید کا یہ جواں سال تازہ قلم کار ایک بڑے نفسیاتی نقاد کا منتظر ہے۔''

(تنقیص و تقریظ۔ڈاکٹر محمد مستمر۔مطبوعہ ۲۰۱۵ء۔ص ۱۶)

ڈاکٹر محمد مستمر کی علمی و تنقیدی تحریروں کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ نفسیاتی تنقید کے موضوع پر کافی دسترس رکھتے ہیں۔ وہ موجودہ علمی و ادبی منظر نامے سے بخوبی واقف ہیں بطور مثال ان کے تنقیدی مضامین کے دوسرے مجموعہ ''پہلو در پہلو'' کو پیش کیا جاسکتا ہے جس میں ان کی ناقدانہ بصیرت کا فنی اظہار بڑی خوش اسلوبی سے ہوا ہے جس کے لئے وہ مبارکباد کے مستحق ہیں۔ امید ہے کہ آئندہ بھی علمی و ادبی اور تنقیدی موضوعات پر ان کی بصیرت افروز تحریریں منظر عام پر آتی رہیں گی۔ لیکن اس میں کوئی دو رائے نہیں کہ ان کی تحریروں میں نفسیاتی تنقید کا رجحان پہلی کتاب میں ہی دیکھنے کو ملتا ہے اگرچہ وہ اس کتاب میں مکمل طور پر آشکار نہیں ہوئے لیکن نفسیاتی رویہ اس پہلی کتاب

میں بھی جگہ جگہ دیکھنے کو ملتا ہے۔ باقی اس کے بعد تو وہ مکمل طور پر نفسیاتی تنقید کے زمرے میں داخل ہو جاتے ہیں۔ بقول طارق سعید کہ تازہ وارِ دِ بساط تنقید کا یہ جواں قلم کار اب کہنہ مشقی کی طرف اپنا سفر طے کر رہا ہے۔ جیسا کہ میرا مضمون کا عنوان ہے ''ڈاکٹر محمد مستمر کا ادبی سفر تنقید سے فکشن تک'' اور یہ ادبی سفر نفسیاتی تنقید سے ہوتا ہُوا نفسیاتی فکشن تک چلا آیا ہے۔ تنقید ہو یا تخلیق وہ دونوں مقام پر ماہرِ نفسیات کے طور پر کھڑے نظر آتے ہیں۔

اردو افسانوں میں نفسیاتی مسائل کے حوالے سے اگر بات کی جائے تو عصری فکشن کے ادبی منظر نامے پر افسانوی ادب میں ایک غیر مانوس مگر متعارف نام ڈاکٹر محمد مستمر کا ہے جن کی کہانیوں میں گاؤں، دیہات اور شہر کے بیچ جو خلا واقع ہو گیا ہے اس کو کم کرنے کی ایک کامیاب کوشش ملتی ہے، شہری زندگی کے الجھے ہوئے حالات و مسائل کی عکاسی ان کے افسانوں کی نمایاں خوبی ہے، اندازِ بیان شگفتہ اور عام فہم ہے، سیدھے سادے الفاظ میں عوامی مسائل اور دکھ درد کو اتنی خوش اسلوبی سے بیان کرتے ہیں کہ قاری کا ذہن اکتاہٹ کا شکار نہیں ہوتا ہے، ان کے یہاں عوامی زندگی کے مسائل کی ترجمانی و عکاسی، سادہ سلیس اور عام فہم انداز میں ہوتی ہے جس کو پڑھ کر قارئین کے ذہن میں ایک وحدتِ تاثر باقی رہتا ہے، ۲۰۰۰ء کے بعد جن افسانہ نگاروں نے اردو فکشن کی تاریخ میں اہم رول ادا کیا ہے اس میں ایک نمائندہ اور قابلِ ذکر نام ڈاکٹر محمد مستمر کا ہے جو لگاتار افسانوی ادب میں اپنی گراں قدر تخلیقات کے ذریعہ اضافہ کر رہے ہیں۔ ان کے افسانوں میں حاشیئے پر پڑے ہوئے لوگوں کے دکھ درد اور مسائل کو بیان کیا گیا ہے ان کے افسانوں میں زمینی حکایت نہیں بلکہ زمینی حقائق وصداقت کو بڑی جگر کاوی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ ان کی کہانیوں میں عام انسانوں کے نجی مسائل کا بیان بڑے دلکش اور حسین پیرائے میں ہوا ہے ان کے یہاں دبے کچلے عام لوگوں کے دلوں کے جذبات کی صحیح عکاسی و ترجمانی کی گئی ہے۔ وہ اپنے افسانوں کے کرداروں کے جذبات و احساسات کی مکمل ترجمانی پر قدرت کاملہ رکھتے ہیں۔ وہ حالاتِ حاضرہ کے عوامی مسائل و رجحانات سے بھی بخوبی واقف ہیں۔ معاشرے کی دکھتی ہوئی رگ پر ان کی گرفت بڑی مضبوط ہے۔ وہ اپنے قارئین کو لفظی بازی گری دکھانے اور خلاؤں کی سیر کرانے کے بجائے حقیقی دنیا کی سیر کراتے ہیں، ان کے افسانوں کے کردار پری پیکر، نازک اندام اور چھوئی موئی نہیں ہیں بلکہ شہری زندگی کی دوڑ دھوپ میں شریک متحرک، فعال اور جفاکش نظر آتے ہیں اور میرے خیال میں یہی کردار نگاری ہی ان کے افسانوں کی نمایاں اور امتیازی شان بھی ہے۔

اردو فکشن کے حالیہ منظر نامے پر اگر نگاہ ڈالی جائے تو ۲۰۰۵ء کے بعد جن افسانہ نگاروں نے اس فن میں خاطر خواہ شہرت و مقبولیت حاصل کی ہے ان میں بلاشبہ ڈاکٹر محمد مستمر کا نام بھی شامل ہے۔ یہ اردو کا ایسا قلم کار اور فکشن نگار ہے جس نے اپنی کہانیوں میں نفسیاتی مسائل کو بڑی باریک بینی سے بیان کیا ہے۔ یقیناً آنے والے دنوں میں اس جواں سال افسانہ نگار کا نام ضرور نفسیاتی فکشن کی تاریخ میں رقم کیا جائے گا۔ ڈاکٹر محمد مستمر کی علمی و ادبی زندگی کا آغاز مضمون نویسی سے ہوتا ہے آگے چل کر انہوں نے تنقیدی موضوعات پر بھی قلم اٹھایا ہے لیکن ان کی اصل پہچان اردو ادب میں ایک نفسیاتی افسانہ نگار کے طور پر ہوتی ہے۔ ان کا پہلا افسانہ ''شاخ مرجھا گئی'' ۲۰۰۸ء میں منظر عام پر آیا تھا۔ اس کے بعد سے وہ لگاتار اور مسلسل اس فن کو ترقی دینے میں جدوجہد کر رہے ہیں اور اس میدان میں انہیں کامیابی بھی نصیب ہوئی ہے۔ بطور مثال ان کی ایک درجن کتابوں کو پیش کیا جا سکتا ہے۔ ان کا پہلا افسانوی مجموعہ مطبوعہ ۲۰۱۵ء یو، پی اردو اکادمی سے انعام یافتہ ہے۔ اور دوسرا افسانوی مجموعہ ''ارتکاب'' قابلِ ذکر ہے نیز وہ مسلسل افسانے لکھتے رہتے ہیں۔

پہلے افسانوی مجموعہ ''حدوں سے آگے میں'' دس افسانے شامل ہیں جن میں ''نا آسودگی اور قدموں کے نشان'' نمائندہ ترین افسانے ہیں۔ ڈاکٹر محمد مستمر کے افسانوں کا دوسرا مجموعہ ''ارتکاب'' کے نام سے ۲۰۲۰ء میں نعمانی پرنٹنگ پریس لکھنؤ سے شائع ہوا ہے، یہ افسانوی مجموعہ اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ کے مالی اشتراک سے منظر عام پر آیا ہے۔ ۱۶۰ صفحات پر مشتمل اس افسانوی مجموعہ میں کل ۱۵/ افسانے شامل ہیں جن میں خاص طور سے ''روڑے، بنا منزل کا مسافر، تنزل، مزہ، ارتکاب اور قدریں'' انتہائی اہم اور قابلِ ذکر افسانے ہیں۔ ان افسانوں کے مطالعہ کے بعد ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اردو کے نامور افسانہ نگار سعادت حسن منٹو اور عصمت چغتائی کی باز یافت ڈاکٹر محمد مستمر کے افسانوں کا خاص موضوع ہے۔ جنسی اور نفسیاتی مسائل کے بیان میں ان کو قدرت کاملہ حاصل ہے۔ لیکن وہ اپنے افسانوں میں منٹو، عصمت، ممتاز مفتی اور دورِ حاضر میں شموئل احمد، مشرف عالم ذوقی، اسرار گاندھی، م ناگ وغیرہ سے جنسی اعتبار سے اس لئے منفرد ہو جاتے ہیں کیوں کہ مستمر کے یہاں جنسی جذبہ اور نفسیاتی گرہیں افرازی نظام پر قائم ہیں۔ ان کے یہاں پائے جانے والے موضوعات سائنسی نطقۂ فکر کی دعوت دیتے ہیں۔ ان کے یہاں جنسیت محض لذت آشنائی نہیں بلکہ ایک مرض کا تعارف پیش کرتی ہے۔ مستمر صاحب بتانا چاہتے ہیں کہ انسان کے اندر پایا جانے والا ہارمونل سسٹم کس طرح اپنا کام کرتا ہے اور اس کی کمی و زیادتی سے انسان کا پورا حیاتی ڈھانچہ گڑبڑا

جاتا ہے۔ جب مستمر کے افسانے کا مطالعہ کروگے تو یہ احساس بخوبی ہوجائے گا کہ مستمر کا جنسی رویہ اپنے ہم عصروں سے کیسے منفرد اور البیلا ہے۔ یہی ہارمونل سسٹم مستمر کو جنسی معاملے میں اپنے ہم عصروں سے ممتاز بھی کرتا ہے اور انفرادیت بھی بخشتا ہے جو ان کے گہرے شعورو ادراک اور مشاہدے کا نتیجہ ہے۔

ان کے افسانوں میں زمینی حقائق کی عکاسی وترجمانی بڑے اچھے انداز میں ہوئی ہے جس کو پڑھنے کے بعد قارئین کا ذہن متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا ہے اور یہی مستمر کے افسانوں کی نمایاں خوبی بھی ہے۔ ڈاکٹر مستمر کے افسانوں کا خاص موضوع نسوانی اور جنسی مسائل ہیں، جنسی بے راہ روی کے خلاف انہوں نے اپنے افسانوں میں نسوانی اور نفسیاتی مسائل کا بیان بڑی باریک بینی سے کیا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ وہ منٹو کی طرح عوامی زندگی کی بھیڑ سے اپنے کرداروں کا انتخاب کرتے ہیں اور ان کے کڑوے کسیلے تجربات ومشاہدات کو اپنے قارئین کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ عصمتؔ نے جنسی موضوعات پر بہت ہی کھل کر لکھا ہے بطور مثال ان کی کہانی ''لحاف'' کو پیش کیا جاسکتا ہے۔ ڈاکٹر مستمر نے بھی اپنے حالیہ افسانوں میں اس موضوع پر کھل کر لکھنے کی ایک کامیاب کوشش کی ہے اور موجودہ ادبی منظرنامہ سے ذرا ہٹ کر نئے موضوعات کو اپنے افسانوی میں جگہ دی ہے۔ جنسی بے راہ روی اور فحاشی کے خلاف یہ انحراف ان کی کہانیوں میں ایک خوش آئند مستقبل کی ضمانت دیتا ہے۔ شہری زندگی کے بکھراؤ اور نسوانی ونفسیاتی مسائل کی عکاسی میں ان کا قلم ہمیشہ حق وصداقت کی پاسداری کرتا ہے۔ ان کے افسانوں میں خواتین کے مسائل کی ترجمانی کافی حد تک اچھے انداز میں ہوئی ہے۔ نفسیاتی و سماجی مسائل ومعاملات کو انہوں نے بڑی چابکدستی سے پیش کیا ہے۔ سماج کے ہر طبقے سے انہوں نے اپنے کرداروں کو چنا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ وہ ایک ایسے حقیقت نگار افسانہ نویس ہیں جنہوں نے حاشیے پر پڑے ہوئے، دبے کچلے انسانوں کے جذبات واحساسات کو اپنے افسانوں کا خاص موضوع بنایا ہے اور اس فن میں وہ کافی حد تک کامیاب وکامران بھی ہوئے ہیں۔ ایسے افسانوں میں خاص طور پر نا آسودگی، بندری، روڑے، وغیرہ کو شامل کیا جاسکتا ہے۔ لیکن مستمر کا جنسی ونفسیاتی اختصاص یہاں بھی دیکھنے کو ملتا ہے۔ ان کی کہانیوں میں قدیم روایات سے ہٹ کر شہر کی چلتی پھرتی عام زندگی کے مسائل کی ترجمانی وعکاسی کی گئی ہے۔ البتہ کہیں کہیں بے جا طوالت سے بھی کام لیا گیا ہے جو افسانے کے قارئین کے طبع نازک پر بہرحال گراں گزرتی ہے امید ہے کہ اس جانب ڈاکٹر مستمر اپنی اگلی کہانیوں میں ضرور توجہ دیں گے۔

اردو فکشن کے افق پر ڈاکٹر محمد مستمر نے بہت جلد ہی اپنا وقار و توازن بنائے رکھا ہے انہوں نے اپنی تحریروں کے ذریعہ حالیہ ادبی منظر نامے میں اپنی منفرد پہچان بنالی ہے جس کا اعتراف کرتے ہوئے انیس امروہوی لکھتے ہیں: ''جنسی موضوعات پر کہانی بُننا ڈاکٹر مستمر کا محبوب مشغلہ ہے، مگر سماج میں پھیلے ہوئے کئی طرح کے ناسوروں پر نشتر زنی کرنے سے وہ کبھی نہیں چوکتے، مستمر کی تحریر اور موضوعات کی قوس وقزح کو دیکھتے ہوئے مستقبل میں ان سے بہت سی توقعات قائم کی جاسکتی ہے۔''

ڈاکٹر ابراہیم افسر کا خیال ہے کہ: ''محمد مستمر کے افسانوں میں ہمیں فرائڈ کے نفسیاتی نظریات کی جھلک دکھائی دیتی ہے، انہوں نے جنس کو صرف لذت کے لئے استعمال نہیں کیا بلکہ جنس کو کردار کی ضرورت کے طور پر اپنے افسانوں میں شامل کیا ہے۔''

(ارتکاب، افسانوی مجموعہ۔ ڈاکٹر محمد مستمر، مطبوعہ نعمانی پرنٹنگ پریس، لکھنو ۲۰۲۰ء ص ۹)

عصرِ حاضر میں جن لوگوں نے اپنے افسانوں میں جنسی، نسوانی اور نفسیاتی مسائل کو بہت کھل کر بیان کیا ہے، ان میں ڈاکٹر محمد مستمر کا نام نمائندہ ترین افسانہ نگاروں کی صف میں شامل کیا جاسکتا ہے، جنسی اور نسوانی مسائل کی عکاسی و ترجمانی ان کا خاص موضوع رہا ہے اور وہ بلاشبہ اس فن میں کامیابی کی منزلوں سے ہمکنار بھی ہوئے ہیں نیز جنسی، نفسیاتی اور نسوانی مسائل سے ان کو فطری لگاؤ ہے۔ جس کا اندازہ ان کے افسانوں کے مطالعہ سے بخوبی ہوتا ہے۔ سعادت حسن منٹو، عصمت چغتائی، عزیز احمد اور کچھ حد تک علیم صبا نویدی نے بھی جنس کے موضوع پر بہت کچھ لکھا ہے۔ فی الحال جنسی حقیقت نگاری کو عام کرنے میں ڈاکٹر محمد مستمر کی انتھک کوششوں کو سراہنے کی ضرورت ہے۔ یہ عصر حاضر کا ایسا سلگتا ہوا موضوع ہے جس پر ہمارے افسانہ نگاروں کو بڑی سنجیدگی سے سوچنے اور کچھ کر گزرنے کی ضرورت ہے۔ ایسے حالات میں اگر ڈاکٹر مستمر نے تنہا جنسی بے راہ روی اور فحاشی کے خلاف قلم اٹھایا ہے تو اس کا سپورٹ ہونا چاہئے۔ انہوں نے سماجی آلودگی اور عصری تقاضوں کی سچائی کو اپنے افسانوں کا موضوع بنا کر قارئین کے سامنے بڑی بے باکی سے پیش کیا ہے۔ ان کی کہانیوں کے کردار سماج کے وہ افراد ہوتے ہیں جن کی جانب عام قلم کاروں کی نظریں کم ہی جاتی ہیں۔ حاشیئے، فٹ پاتھ اور عام شاہراہوں پر پڑے ہوئے دبے کچلے انسانوں کی بھیڑ میں وہ اپنے کرداروں کو تلاش لیتے ہیں اور ان کی کمیوں کو قریب سے دیکھنے کے بعد اس خوش اسلوبی سے بیان کرتے ہیں اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہم افسانہ نہیں پڑھ رہے ہیں بلکہ ان شاہراہوں کا بہ چشم خود نظارہ کر رہے ہیں۔ میرے خیال میں کردار نگاری کا یہ ملکہ ایک اچھے فنکار کی نمایاں خوبی ہے جس کے لئے ڈاکٹر محمد مستمر

قابلِ مبارکباد ہیں۔ ہم طوالت سے گریز کرتے ہوئے اپنی بات کو ڈاکٹر الف ناظم کے اس اقتباس پر ختم کرتے ہیں۔

''ارتکاب کے افسانے موضوع اور مواد کے تنوع اور جدتِ فکر کی بنا پر دلچسپی سے پڑھے جانے کے مستحق ہیں اس مجموعے کے افسانے ''روڑے، تنزل، ارتکاب اور تغیر وغیرہ خصوصی توجہ سے پڑھے جانے کا تقاضا کرتے ہیں کیوں کہ ان میں قاری عصری زندگی کی ان کربناک حقیقتوں سے روبرو ہوتا ہے جو عموماً نظروں سے اوجھل ہوتی ہے۔''

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ ڈاکٹر محمد مستمر نے اپنے مختصر اور طویل افسانوں میں نفسیاتی اور جنسی مسائل کی عکاسی وترجمانی میں جو کردار تخلیق کئے ہیں۔ ان میں گاؤں، دیہات اور شہر کی بھاگتی ہوئی زندگی کے بیچ جو خلا واقع ہو گیا ہے اس کو کم کرنے کی ایک کامیاب کوشش کی ہے۔ ان کے افسانوں میں برق رفتار ترقی کے ساتھ بدلتی ہوئی قدروں کی پامالی کا شکوہ بھی ہے اور اس کا علاج وحل بھی۔ انہوں نے عوامی زندگی کے سلگتے ہوئے مسائل کو بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ سیدھے سادے اور دلکش اسلوب میں اس طرح پیش کیا ہے کہ قاری کا ذہن تھوڑی دیر کے لئے کہانی پڑھتے پڑھتے رک کر کچھ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ چنانچہ گھریلو مسائل اور نجی زندگی کے حالات وواقعات کو بیان کرنے پر ان کو قدرت کاملہ حاصل ہے۔ ان کی کہانی ایک فردِ واحد کی داستان المناک نہیں ہے بلکہ شہری زندگی اور انسانیت کے مسائل اور پورے سماج کی بھرپور عکاسی وترجمانی کرتی ہے۔

☆☆☆

Afsana افسانہ

lakeerein by Prof. Shahina Rizvi(Ex.HOD Urdu MGKVP University,VNS)

پروفیسر شاہینہ رضوی (سابق صدر، شعبہء اردو، مہاتما گاندھی کاشی ودیاپیٹھ یونیورسٹی، وارانسی)
cell-9307380555

لکیریں

مجھے کبھی سمجھ میں نہ آیا کہ عشق کے انداز کیا ہوتے ہیں۔کبھی عجیب سے مثلث ہوتے ہیں۔کبھی ایک کے پیچھے دوسرا۔دوسرے کے پیچھے تیسرااور And So..On کبھی کوئی شخص عجیب انداز میں سب کا منظور نظر بنتا ہے کہ اکثر عجیب شکلیں تیار ہوتی ہیں،بنتی ہیں۔بگڑتی ہیں،ٹوٹتی ہیں،جڑتی ہیں۔ایک چیز کا بننا اور بگڑنا تو سمجھ میں آتا ہے، پر اگر زاویے اور لائنیں بار بار ٹکرائیں تو کبھی زندگی مصیبت بن جاتی ہے،اور کبھی آسان ہوجاتی ہے۔جو نہ ساری عمر آنسو بہاتی ہے اور نہ ساری عمر کھلکھلاتی ہے۔

میری مسز صدیقی سے پہچان اس وقت ہوئی جب میں اپنی بیٹی رومی کی کلاس ٹیچر سے ملنے گئی۔وہ اور کوئی نہیں مسز صدیقی تھیں۔دبلی۔پتلی اور درمیانہ قد،گندمی رنگت اور آہستہ آہستہ بولنے والی شخصیت۔ایک لمحہ کو ہم ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔کچھ تھا ہمارے بیچ۔کیا؟ کبھی کبھی دو انجان لوگ بھی کس قدر قریب ہوتے ہیں اور کبھی ساتھ زندگی گزارنے والے بھی دو الگ الگ قطب کے رہنے والے ہوتے ہیں۔جن میں کوئی قدر مشترک نہیں ہوتی۔ہم لوگوں میں کافی دوستی ہوگئی۔گھر میں آنا جانا ہوگیا۔کافی اچھے Family Terms ہوگئے۔اس روز بھی ہم مسز صدیقی کے گھر چائے پی رہے تھے۔انہوں نے مجھے بتایا تھا کہ مسٹر صدیقی کے دفتر میں بہت کام رہتا ہے،اس لئے وہ عام طور پر آٹھ بجے کے بعد آتے ہیں۔میرا طلاق ہوئے دس سال کا عرصہ گزر چکا ہے۔کبھی میری بیٹی مسز صدیقی کے ساتھ ہی اسکول سے گھر آجاتی اور میں آفس سے وہیں پہنچ جاتی ہوں۔ان کا ایک سات سال کا بیٹا ہے شہاب۔

جانے کیوں مجھے اکثر محسوس ہوتا رہا کہ کچھ ضرور ہے جو اس Family میں Normal نہیں ہے۔کیا؟ سمجھ میں نہیں آتا تھا۔میری مسٹر صدیقی سے ان کے بچے کی Birth day Party میں دوبار ملاقات ہوئی۔میں طلاق شدہ ہوں اور ایک بیٹی کی ماں بھی،اس لئے میں زیادہ تر جلدی گھر پہنچنا چاہتی تھی کہ ہم اکیلی عورتیں مردوں کی نظروں میں شکار کے لئے زیادہ موزوں ہوتی ہیں۔بہر

حال اور سب ٹھیک ٹھاک تھا۔ مجھے شادی کے بعد تین سال کے عرصے میں بڑے تلخ تجربوں سے گزرنا پڑا۔ کبھی میری معمولی شکل وصورت پر طنز کی بوچھار ہوتی تو کبھی میری نوکری پر۔ کھانا پکانے میں ماہر نہ سہی لیکن گرہستی چلانے لائق اچھا خاصہ پکا لیتی تھی۔ لیکن چونکہ میں نوکری کرتی تھی، تو ذرا بھی مرچ نمک کا توازن گڑبڑایا نہیں کہ اتنی لعنتیں پڑتیں کہ پوچھئے مت۔

" گرہستی چلانا آسان ہوتا ہے کیا؟ جو عورت کھانا پکانا نہ ہی نہ جانتی ہو، وہ گھر کیا چلائے گی۔ باہر گھومنا تو سب کو آتا ہے"۔

میری ساس کہتیں، وہ مجھے احساس کرانا چاہتی تھیں کہ میری نوکری کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ بلکہ یہ ایک قسم کی آوارہ گردی ہے۔

" آپ بھی تو اماں کیا چن کر بہولائی ہیں۔ زندگی بھر تو مجھے جھیلنا ہے،"

میرے شوہر نصرت کیوں پیچھے رہتے۔ حالانکہ میں جانتی تھی کہ ان لوگوں نے سوچ سمجھ کر نوکری پیشہ بہو چنی تھی۔ میرے شوہر بھی معمولی کلرک ہی تھے۔ میرے سسر کافی بوڑھے۔ یہ ان کی دوسری شادی تھی۔ پہلی بیوی سے اولاد ہی نہیں ہوئی اور ان کے انتقال کے بعد دوسری شادی ہوئی تو چھ بچوں کی ذمہ داری آ پڑی۔ میرے سسر کی سرکاری نوکری نہیں تھی تو ان سے معاشی طور پر اب کوئی فائدہ نہیں ملتا تھا۔ ایک بڑے بھائی کی شادی ہو چکی تھی، وہ دوسرے شہر میں رہتے تھے۔ چار بہنوں میں دو کی شادی ہو چکی تھی اور دو باقی تھی۔ ایک نند فصیحہ ایک پرائیوٹ اسکول میں پڑھاتی تھی اور بہ مشکل پانچ سو روپئے ملتے تھے۔ میں اس وقت سرکاری دفتر میں Legal Assistan تھی۔ خاصی تنخواہ تھی لیکن شاید ان لوگوں کو اسی بات کا ڈر تھا کہ کہیں میں ان پر حاوی نہ ہو جاؤں۔ دبا کے رکھنے کا یہ آسان طریقہ تھا کہ بات بات میں احساس کمتری دلایا جائے تاکہ انہیں معاشی فائدہ بھی ہو۔ اور میرے پر نہ نکلنے پائیں۔ یہ بات میں اس وقت نہیں سمجھ سکی تھی۔ سر منڈاتے اولے جو پڑنے لگے تھے، پھر عمر بھی کم تھی۔ مجھے سمجھ میں ہی نہیں آتا تھا۔ ایسا کیوں ہے۔؟ مجھے وہ لوگ ناسمجھ لگتے تھے۔ یہ ہشیاری تو اب سمجھ میں آتی ہے۔

روز کے طعنوں سے اور نصرت کی بیہودگی سے میں بہت پریشان رہتی تھی۔ دل چاہتا تھا کہ دفتر دن رات کھلا رہے۔ حد تو تب ہوئی جب میں Pregnent تھی۔ کچھ کھا پی نہیں پاتی تھی۔ اعضا بھی تھکے تھکے رہتے تھے۔ آفس سے آ کر اس دن میں لیٹ گئی۔ مجھ سے اٹھا نہیں جا رہا تھا، حالانکہ میں خود سہمی سہمی سی رہتی تھی۔ طعنوں سے بچنے کے لئے بے انتہا کام کرتی تھی لیکن اس دن اٹھا نہیں جا رہا

تھا۔نصرت نے مجھے جھنجھوڑ کر اٹھایا۔

"یہ کون سا وقت ہے سونے کا"

میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی لیکن چکرا کر بستر پر گر پڑی۔

"یہ کون سا ڈھونگ بنا رکھا ہے۔کون سی چال ہے یہ"

اس نے مجھے گھورا۔پہلی بار ہاں پہلی بار منھ سے جواب نکلا۔

"تمہیں نہیں معلوم، مجھے کیا ہوا ہے۔؟"

بس صاحب۔کون سی گالی تھی جو نہ سنی ہو۔دفتر کے ہر مرد سے میرا ناطہ جوڑا گیا اور دو زنا ٹے دار تھپڑ۔پھر وہ شخص جو میری نظروں سے گرا تو کبھی عزت نہ پا سکا۔اور پھر مجھے کچھ ایسی ضد آئی کہ میں نے گھر کے سارے کام چھوڑ دئے۔صرف آفس جاتی تو کبھی لوٹتے ہوئے جان بوجھ کر مسز کول کے گھر ایک آدھ گھنٹہ رک جاتی، اس کے لئے پہلے یہ سنا۔

" آ گئی حرام زادی! اپنے یار سے چھٹی پا گئی۔ارے ہمارے نصیب ہی بگڑے تھے کہ ایسی بدکردار لڑکی بیاہ لائے۔نصرت کا تو مقدر ہی کھوٹا تھا۔ارے بیٹا تو مت گھبرا، میں تیری دوسری شادی کر دوں گی۔پری بیاہ کر لاؤں گی۔"

اور سعادت مند بیٹا ماں کے پاس بیٹھا گھورتا رہتا اور رات کو نہایت بے دردی سے میرا ستعمال کرتا لیکن میرے ہونٹ جو سلے تو کھلے ہی نہیں۔اور میری نافرمانیاں جو شروع ہوئیں تو پھر بند ہی نہ ہوئیں۔کئی بار نصرت کو چھپ چھپ کر اپنا تعاقب کرتے دیکھا۔پیدا ہوئی تو لڑکی، میں تو خوش تھی لیکن میری مصیبتیں بڑھ گئیں۔جب آفس جانے لگی تو ایک دن پلٹ کر آئی تو ماں بیٹے کی سرگوشی کی آواز میرے کانوں تک پہنچ گئی۔

"دیکھو بات تو چل رہی ہے۔خدا کرے مان جائیں۔" ماں نے کہا۔

"اماں اچھی طرح ان کے دماغ میں نازیہ کی بے ہودگی کی تصویر بٹھاؤ تا کہ کام جلدی بن جائے۔" بیٹے کا قول تھا۔

"ہاں، کوشش تو کر رہی ہوں۔راضی ہوتے ہی فوراً نکاح کر دوں گی۔"

"اماں ایک بہو سے تو نپٹ نہیں پا رہی ہو۔کیوں مصیبت دوگنی کر رہی ہو" یہ وصیہ کی آواز تھی۔وہ کبھی ایسی اسکیموں میں شامل نہیں ہوتی تھی۔بار بار ان لوگوں کو سمجھاتی بھی تھی۔نند کے ناطے اس نے مجھ سے بھی کہا تھا۔بھابھی آپ تو سمجھ دار ہیں۔کوئی راہ نکالئے کہ آپ کے ساتھ بھی غلط نہ ہو اور ان کا رویہ

بھی سدھر جائے۔

"مجھ سے دیکھا نہیں جاتا۔اماں اپنی چالاکیوں میں اندھی ہیں، بھیا بدعقل کہ بسی بسائی گرہستی اجاڑنا چاہتے ہیں۔"

اور میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کروں۔ان کے ظلم بڑھتے جا رہے تھے۔مجھے نہ صبح ناشتہ ملتا تھا نہ رات کھانا۔میرے ناشتہ سے لے کر رات کے کھانے تک کا وقفہ آفس کے آٹھ گھنٹوں تک محدود تھا۔اس رات میں رات بھر سوچتی رہی، صرف سوچتی رہی۔دوسرے دن آفس سے آدھے دن کی چھٹی لے کر آ گئی۔میں نے یہ وقت اس لئے چنا تھا کہ اس وقت گھر پر مصیبت کی طاقت آدھی سے بھی کم رہتی تھی۔چھوٹی نند فصیحہ اسکول چلی جاتی تھی۔نصرت اپنے دفتر۔وصیہ کے دل میں میرے لئے نرم گوشے تھے۔صرف ساس سے مورچہ لینا تھا۔سسر بے چارے گھر میں ایک الگ کمرے میں پڑے رہتے تھے۔میری قسمت اچھی تھی کہ ساس گھر پر نہیں تھیں اور میری بیٹی رومی سو رہی تھی۔میں نے اپنے اور رومی کے ضروری کپڑے اور میکے سے ملے ہوئے زیور جو میرے پاس بچ گئے تھے۔ایک بڑی اٹیچی اور بیگ میں رکھ لئے اور رکشہ بلایا۔میکہ بھی اسی شہر میں تھا۔اور رومی کو لے کر باہر چل دی۔اچانک آنگن میں وصیہ دکھائی دی۔اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

"جاؤ بھابھی، میں تمہیں نہیں روکوں گی۔خدا تمہیں زندگی میں سکون اور آرام دے۔پھر بھی میں دعا کروں گی کہ بھیا اور اماں کو اب بھی عقل آ جائے تمہارا تو کچھ نہیں بگڑے گا لیکن بگڑے گا اب یہ گھر۔"

دروازے سے باہر قدم رکھا ہی تھا کہ سسر کو چھڑی کے سہارے کھڑا دیکھا۔میں نے سلام کیا تو میرے سر پر ہاتھ رکھ کر صرف اتنا کہا۔

"خدا حافظ بیٹا، سدا خوش رہو" اور میں دکھی من کے ساتھ اپنے گھر آ گئی۔پھر جو گھر آئی تو واپس گئی ہی نہیں۔ڈرانے دھمکانے سے لے کر منت سماجت سب ہوئی لیکن بات صرف طلاق پر ختم ہوئی۔دراصل مجھے ہی ان لوگوں نے صحیح Assess نہیں کیا۔حالات کے خلاف میرا ردعمل مختلف تھا۔

میں نے اپنے تجربے سے یہ جانا کہ شوہر یا تو اچھے ہوتے ہیں یا برے۔مسز صدیقی کی زندگی کی گہرائیوں میں میں نے کبھی جانے کی کوشش نہیں کی۔طلاق کے بعد ان لوگوں نے کبھی رومی سے ملنے کی کوشش نہیں کی۔

اس شام کو میں مسز صدیقی کے گھر پر ہی تھی کہ اچانک فون کی گھنٹی بجی۔مسز صدیقی نے فون اٹھایا اور کچھ چونک سی گئیں۔

"اوہ تم ہو"

"نہیں گھر پر ہی رہوں گی"

" آجاؤ"

کہہ کر انہوں نے فون رکھ دیا۔لیکن کچھ بے چین سی تھیں۔ ہماری دوستی عمر کے اس موڑ پر ہوئی تھی جب بے تکلفی ذرا مشکل سے آتی ہے۔انسان اتنا کچھ دنیا دیکھ چکا ہوتا ہے اور ذہن میں اتنی پیچیدگیاں آچکی ہوتی ہیں کہ دوستی کی طرح بے حجاب و بے تکلف رشتہ مشکل سے بن پاتا ہے۔ پھر بھی پوچھ بیٹھی۔

"کیا بات ہے"

انہوں نے اس طرح چونک کر دیکھا جیسے کشمکش میں ہوں کہ بتائیں یا نہ بتائیں۔ پھر ادھر ادھر دیکھا، رومی ایک کونے میں بیٹھی شہاب کو کچھ بتا رہی تھی۔

"بڑی لمبی کہانی ہے"

"پھر بھی"

ایک بار انہوں نے غور سے میری طرف دیکھا، بولیں۔

"مس نازیہ، میں بہت بے ترتیب اور بکھری ہوئی ازدواجی زندگی جی رہی ہوں اور اس پر یہ مصیبت، سمجھ نہیں پاتی کہ کیا کروں"

میں حیرت زدہ انہیں دیکھ رہی تھی۔ میں کچھ سمجھ نہیں پا رہی تھی۔کہاں پر کیا غلط ہے؟ کس کا فون تھا؟ کیوں بے چین ہیں۔کوئی کڑی کہیں ملتی تھی تو کہیں ٹوٹ جاتی تھی۔خود ہی بولیں۔

" شادی کے پہلے میں کسی کو پیار کرتی تھی، لیکن شادی نہ ہوسکی۔ حالات ہی کچھ ایسے بنے، وہ اپنے ماں باپ سے کہہ نہ سکا اور میں ذہنی اور جذباتی دونوں طرح سے کمزور تھی۔ میں رضوان سے کچھ نہ کہہ سکی۔ نہ پوچھ سکی۔لیکن دل خون ہوگیا۔ میں جیسے ٹوٹنے لگی تھی۔ میری امی بہت سمجھ دار عورت ہیں۔ اگر میں نے امی کو بتا دیا ہوتا تو آج حالات دوسرے ہوتے۔ امی نے میری حالت سے ضرور کچھ اندازہ لگا لیا تھا اور ان کے بار بار میری اداسی کا سبب پوچھنے پر ایک دن میں رو پڑی اور سب کچھ بتا دیا۔ وہ سر پکڑے بیٹھی رہ گئیں۔

" کاش بیٹا، تم نے پہلے بتا دیا ہوتا۔"

" واقعی مسز صدیقی، ایسی سمجھدار مائیں ہندوستان میں ملتی نہیں۔" میں بولی۔

"میں صرف اٹھارہ سال کی تھی، کچھ بھی سمجھ نہ پائی تھی، سب کچھ اچانک ہوا کہ کچھ سمجھ نہ سکی۔صرف دعائیں مانگتی رہی، رضوان کی منگنی ٹوٹ جائے۔لیکن کہیں دعائیں اس طرح کام کرتی ہیں۔"

وہ خاموش ہوگئیں۔میں بھی چپ تھی۔یہ سارے انکشافات میرے ذہن کو پریشان کر رہے تھے۔

"امی نے مجھے سمجھا بجھا کر راضی کرلیا کہ میں شادی کرلوں۔انہوں نے اس انداز سے سمجھایا کہ شادی کرنا صحیح لگا۔"

"اور آپ کی شادی صدیقی صاحب سے ہوگئی اور اب آپ لوگ Adjust نہیں کر پا رہے ہیں"

"نہیں صاحب، فوراً ایسا نہیں ہوا۔ابھی جن کا فون آیا تھا، اسی زمانے میں ان کی ماں ان کا پیغام لیکر میرے گھر آئی تھیں۔دیکھنے اور باتیں کرنے میں معقول نظر آتی تھیں۔ان کے صاحب زادے بھی آئے تھے۔پھر یہ صاحب اکثر یونیورسٹی جاتے ہوئے راستے میں مل جاتے۔میٹھی میٹھی باتیں کرتے۔میں ٹوٹی ہوئی تھی، سچ پوچھو تو مجھے ان کی باتیں اچھی بھی لگتی تھیں۔یہ بھی لگتا تھا کہ شاید شادی بھی انہیں سے ہو جائے۔مجھے ٹھیک ہی لگتا تھا۔لیکن جانچ پڑتال سے یہ معلوم ہوا کہ شادی شدہ ہیں۔اور امی نے بات وہیں ختم کردی۔میرے لئے یہ دوسرا جھٹکا تھا۔مجھے لگتا تھا دنیا بہت ظالم ہے اور میرا نصیب کھوٹا۔اسی زمانے میں صدیقی صاحب کا رشتہ آیا اور کافی سوچ بچار اور پرکھ کے بعد ان سے شادی ہوگئی۔رخصتی کے بعد ہی یقین آیا کہ میرے نصیب میں کچھ ہے۔شادی کے بعد کچھ دن اچھے گزرے۔

دراصل میں ہی بہت سادہ لوح تھی۔کچھ سمجھ ہی نہ سکی ورنہ صدیقی صاحب کا یہی طریقہ تھا جواب ہے۔وہی رات کو بارہ ایک بجے آنا، کھانا کھانا، بستر پر لیٹنا اور ایک فرض کی طرح مجھے باہوں میں بھرنا اور اپنی جنسی بھوک مٹانا اور سو جانا۔آہستہ آہستہ مجھے یہ میکانکی انداز کھلنے لگا۔اکثر میں ان سے جلدی آنے کو کہتی، یہ وعدہ بھی کرتے لیکن وعدہ پورا نہ ہوتا۔پھر مجھے اور بھی معلوم ہونے لگا۔ان کے دوسری عورتوں سے تعلقات، جوئے اور شراب کی عادت جو بہت چھپا کر کرتے تھے۔میرے پوچھنے پر انہوں نے خود کہا کہ انہیں کوئی ایک عورت کبھی Satisfy ہی نہیں کر سکتی۔میں بہت روئی، گڑگڑائی لیکن بے سود۔یہ پلٹ کے آ ہی نہیں سکتے تھے۔میں نے حالات سے سمجھوتا کرنا شروع کردیا۔دل کو تسلی دی کہ اگر میری قسمت میں سکھ ہوتا تو رضوان ہی مجھ سے کیوں دور ہوتا۔مجھے تو پہلے ہی سمجھ لینا چاہئے تھا۔اتنے دنوں تک پتھر سے کیوں سر پھوڑتی رہی۔کہیں پتھر پر بھی نشان پڑتے

ہیں۔سرلہولہان ہوجاتا ہے۔"

وہ خاموش ہوگئیں، یں ہمہ تن گوش تھی۔

" بچے کے لئے میں نے سمجھوتا کرلیا۔آنکھیں ،کان اور احساسات اور جذبات سب پر تالے ڈال دئے ،نوکری کرلی۔لیکن ایک ناگہانی مصیبت سے بھی چھٹکارہ نہیں مل رہا۔وہ صاحب جن سے کبھی رشتہ طے ہورہا تھا،ان کے دونوں لڑکے میرے اسکول میں پڑھتے ہیں۔دوسال سے میں ایک کشمکش میں مبتلا ہوں۔"

"Parents day پران صاحب سے پھر ملاقات ہوگئی۔مجھے اس میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔پھر بھی وہ مجھ سے باتیں کرنے کے بہانے ڈھونڈتا ہے۔حالانکہ اس نے کبھی کوئی حدنہیں پار کی۔اس لئے کبھی کبھی مجھے بھی خوشی ہی محسوس ہوتی ہے کہ دنیا میں کوئی تو ہے جو میرے لئے سوچتا ہے، بے تاب ہوتا ہے۔ایک نامعلوم سا جذبہ ہم دونوں کے بیچ ہے جس کی بنیادیں الگ ہیں۔وہی آرہے ہیں اپنے بچے کے مسئلے پر بات کرنے۔میں اس سے ملنا بھی نہیں چاہتی اور ملتا ہے تو بھگائے بھی نہیں بن پڑتا۔کبھی کبھی الجھن اس کی باتوں سے ہوتی ہے کہ اس کے دل میں میرے لئے نرم گوشے ہیں۔جس کے دل میں نرم گوشے ہوں اس سے پیار نہیں کرسکتی اور جس سے پیار چاہتی ہوں وہ دور بھاگتا ہے۔عجب قسمت ہے۔"

تبھی دروازے کی گھنٹی بج اٹھی۔انہوں نے دروازہ کھولا، اس نے مجھے دیکھا اور چونک پڑا۔

"ارے تم!"

"اورتم یہاں کیسے؟" میں پوچھے بغیر نہ رہ سکی۔

"کیاتم ایک دوسرے کو جانتے ہو" مسز صدیقی نے پوچھا۔جواب میں نے ہی دیا۔

"جی مسز صدیقی، یہ میرے سابق شوہر نصرت ہیں"

رومی حیرت سے کبھی مجھے،کبھی نصرت کو دیکھ رہی تھی اور میں کبھی کوئی شکل نہیں بنا پارہی تھی ،کس لکیر کو کہاں کھینچوں، کسے مٹاؤں، کیا سچ ہے کیا غلط۔

☆☆☆